وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۲۹ شمارہ ۴

ذُوالقعدہ ۱۴۳۱ء ـ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ اکتوبر ـ دسمبر ۲۰۱۰ء

بیادگار:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ـــ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر : حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
حافظ محمد زبیر ـ حافظ نذیر احمد ہاشمی
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے مطبوعات

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور ـ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون : 200 روپے ، فی شمارہ :50 روپے

اس شمارے میں

حرفِ اوّل

بچاؤ کا ایک ہی راستہ.....	حافظ عاطف وحید	3

مضامین قرآن

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	4

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید مع صرفی ونحوی تشریح	افادات حافظ احمد یارؒ	9

حکمتِ نبویؐ

تقویٰ کی فضیلت	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	20

توضیح و تنقیح

نظریہ وحدت الوجود اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ	حافظ محمد زبیر	23

حسن معاشرت

گھریلو تشدد کی روک تھام کی تدابیر	محمد رضی الاسلام ندوی	39

فکر و نظر

شریعت اسلامی میں شراب نوشی کی سزا	حافظ نذیر احمد ہاشمی	59

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	71

ایجاد و ابداعِ عالم

THE PROCESS OF CREATION	Dr. Israr Ahmad	84

بیان القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

حرفِ اول

بچاؤ کا ایک ہی راستہ

ملک عزیز کے دگرگوں سیاسی' معاشی اور معاشرتی حالات پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ کرپشن کے ناسور نے جڑیں اتنی گہری پکڑ لی ہیں کہ اب بغیر بڑی سرجری کے اس کا خاتمہ نظر نہیں آتا۔ مہنگائی کا سیلاب ہے کہ تھم کے ہی نہیں دیتا۔ غریب آدمی جائز ناجائز کی تمیز سے مستغنی ہونے پر گویا کہ مجبور ہو چکا ہے۔ اوپر سے بدامنی اور قتل و غارت بھی عام سی بات بن چکی ہے۔ نفاقِ عملی کی مختلف شکلیں مہیب صورت اختیار کر چکی ہیں۔ جھوٹ' وعدہ خلافی' خیانت اب بُرائی ہی محسوس نہیں ہوتی۔ پوری قوم عذاب کی گرفت میں ہے۔ ایسے میں مذہبی منافرتیں اور فتویٰ بازیوں کا بازار بھی گرم ہے۔ حق پرست رجالِ دین' جنہوں نے پوری زندگیاں دین کی اشاعت اور حکم و اقامت کی جدوجہد میں کھپا دیں' فرقہ پرست مولویوں کی دستبرد سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ یہ اصل میں اِس دور کی ''خارجیت'' ہے کہ ہر کس و ناکس کی تکفیر کی جائے۔ قرنِ اوّل کی خارجیت نے بظاہر انتہائی متدین' متقی اور موحد قسم کے طبقے کے ہاتھوں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما جیسی شخصیات کی تکفیر کی تو آج کی خارجیت کیوں پیچھے رہے؟ رجالِ دین اس خارجیت کے اصل اہداف اس لیے ہیں کہ اُن کی تکفیر کیے بغیر اِن کی دکانداری نہیں چلتی۔ اسی لیے کبارِ رجالِ دین میں سے شاید ہی کوئی ہو جو بچا ہو۔

دینِ خالص کی خدمت کرنے والوں کے لیے یہ بہت سخت مرحلہ ہے۔ ان کے لیے صبر و استقلال کا مظاہرہ کرنا از بس ضروری ہے۔ ورنہ شیطان کی چال بڑی سخت ہے۔ وہ وہاں سے پٹخنی دیتا ہے جہاں سے انسان کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عہد وفا استوار رکھا جائے....' اس کے پیغام ہدایت کے ساتھ مضبوط تمسک کیا جائے...' دین کے مطالبات سے عہدہ برآ ہوا جائے....' خیر امت کا حصہ ہونے سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں پورا کیا جائے.....اور ہر قسم کے کٹھن حالات میں ''ہدایت'' کی شمع روشن رکھی جائے۔ اس حوالے سے اسلامی تاریخ پر عزیمت سلف صالحین کے مجاہدانہ کردار سے بھری پڑی ہے۔ یہیں سے آج کے حق پرستوں کو درست لائحہ عمل ملے گا۔ اس ایک مستقیم راستے کے سوا تمام راستے تباہی کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائے۔ آمین!

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

از: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
ترتیب وتدوین: سید برہان علی

سُورۂ سَبَا

یہ سورۂ مبارکہ چھ رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اس کا زمانۂ نزول مکّہ کا متوسط یا ابتدائی دور محسوس ہوتا ہے۔ اس سورۃ میں کفار کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت اور آپؐ کی نبوت پر طنز و استہزاء اور بے ہودہ الزامات کی شکل میں کرتے تھے۔

اس سورۃ کا آغاز ''الحمد للّٰہ'' کے الفاظ سے ہوا ہے اور یہ امر باعثِ دلچسپی ہے کہ ''الحمد للّٰہ'' سے شروع ہونے والی سورتیں قرآن حکیم میں سات سات پاروں کے وقفہ سے آئی ہیں۔ سب سے پہلی سورۃ ''الفاتحہ'' کا آغاز ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ سے ہوا ہے' پھر ساتویں پارے میں سورۃ الانعام ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ کے الفاظ سے شروع ہوئی' پھر پندرھویں پارے میں سورۃ الکہف ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ کے الفاظ سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد بائیسویں پارے میں دو سورتیں سورۂ سبا اور سورۂ فاطر ''الحمد للّٰہ'' کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں۔ حمدِ باری تعالیٰ کے موضوع پر سورۂ سبا اور سورۂ فاطر کا جوڑا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اس سورۃ کا آغاز بڑا پُرجلال ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ۝﴾

''تمام شکر اور کُل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جو آسمان وزمین کی ہر شے کا مالک ہے' اور اُسی کے لیے حمد و ثنا ہے آخرت میں بھی' اور وہی کمال حکمت والا اور ہر شے سے باخبر ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں (خواہ پانی کا ایک قطرہ ہی ہو جو زمین میں جذب ہو جاتا ہے) اور جو کچھ اُس سے نکلتا ہے (خواہ ایک بیج ہی ہو جس کے زمین میں پھوٹنے سے پتیاں باہر نکلتی ہیں) اور (جانتا ہے) جو کچھ اُترتا ہے آسمان

سے اور جو کچھ چڑھتا ہے اس میں۔ اور وہ رحمت اور مغفرت فرمانے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا' توحید اور ایمان باللہ کے اس بیان کے بعد آخرت اور اس کے بعد رسالت کا ذکر ہوا۔ چنانچہ آیت ۳ میں ارشاد ہوا: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ﴾ ''اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی کہ قیامت نہیں آئے گی''۔ اس کا جواب دیا: ﴿قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ﴾ ''آپ کہہ دیجیے: کیوں نہیں! میرے رب کی قسم جو کل غیب کا جاننے والا ہے وہ ضرور آئے گی''۔ اس کے بعد آیت ۶ میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے حق ہونے کا تذکرہ ہے۔ فرمایا: ﴿وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ﴾ ''اور جانتے ہیں (اہلِ کتاب میں سے) وہ لوگ جن کو علم دیا گیا ہے کہ (یہ قرآن) جو آپ کے ربّ کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے' وہ سچ اور حق ہے۔''

دوسرے رکوع میں حضرات داؤد وسلیمان علیہما السلام کا ذکر ہے۔ پہلے ان دونوں پر اللہ کی طرف سے کیے گئے انعامات کا تذکرہ ہوا کہ ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے فضیلت عطا کی کہ پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے اور ہم نے ان کے لیے لوہے کو نرم کر دیا اور انہیں ہدایت کی کہ اس کی زرہیں بنائیں اور کڑیوں کے جوڑنے میں مناسب اندازہ کریں اور وہ سب نیک کام کیا کریں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حوالے سے ذکر ہوا کہ ہم نے ہوا کو اُن کے لیے مسخر کر دیا تھا اور ان کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا ایک چشمہ بہا دیا اور ایسے جن اُن کے تابع کر دیے جو اللہ کے حکم سے اُن کے آگے کام کرتے تھے۔ ان انعامات کے تذکرے کے بعد فرمایا: ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ ''(اللہ نے جو کچھ تمہیں عطا کیا ہے) اے آلِ داؤد اس پر عمل کرو شکر کرتے ہوئے' حال یہ ہے کہ تھوڑے ہی بندے شکر گزار ہوتے ہیں''۔ (آیات ۱۰'۱۳)

آیت ۱۴ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کے متعلق بتایا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی موت کا حکم صادر کر دیا تو جنّات کو ان کی موت کا علم نہیں ہوا۔ آخر کار جب گھن نے اُن کے عصا کو کھا لیا اور حضرت سلیمانؑ گر پڑے تو جنّات کو ان کی موت کا پتا چلا۔ اگر جن غیب کا علم جانتے ہوتے تو وہ اتنا عرصہ ذلّت کی تکلیف میں نہ رہتے۔ اس سے دونوں باتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ جن اگر بزعم خود غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہوں تو وہ غلط ہے اور اگر عام لوگ جنوں کو غیب دان سمجھتے ہوں تو ان کی غلط فہمی کا بھی ازالہ ہو گیا۔

اس کے بعد قومِ سبا کا ذکر ہوا جو اپنے وقت کی بڑی مہذّب قوم تھی اور بڑے سرسبز وشاداب علاقے کی مالک تھی۔ غالباً تاریخِ انسانی کا پہلا بندان کے علاقہ یمن میں باندھا گیا جس سے ہر طرف ہریالی' شادابی اور خوشحالی پیدا ہوئی۔ اس خوشحالی میں بجائے اللہ کے شکر کے اُن میں سرکشی پیدا ہوتی چلی گئی' جس کے نتیجہ میں بند ٹوٹ گیا اور سیلاب سے ان کا سارا علاقہ تباہ و برباد ہو گیا۔ اس طرح اللہ کے غضب نے اُس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر اس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم سر نہیں اٹھا سکی۔ (آیات ۱۵ تا ۱۷)

تیسرے رکوع کے آخر میں وہ آیت ہے جو اکثر ہماری تقریروں میں بطور حوالہ بیان ہوتی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

''اور (اے محمد ﷺ) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر' لیکن اکثر لوگوں

کو معلوم نہیں ہے۔''

اس سے پہلے آیت ۶ میں محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے حق ہونے کا ذکر تھا اور اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے عالمگیر ہونے کا بیان ہے کہ آپؐ کی بعثت کی غرض یہ ہے کہ آپ تمام نوعِ انسانی کو اچھے اور برے اور نیک و بد کی تعلیم دیں اور نیکیوں پر خوشخبری دیں اور برائیوں پر لوگوں کو جہنم کے عذاب سے ڈرائیں۔ اب جو سمجھ دار ہوں گے وہ تو آپ کی بات مان لیں گے لیکن دنیا میں اکثریت جاہلوں اور ناسمجھوں کی ہے۔

چوتھے رکوع میں ہٹ دھرمی اور کفر کی روش اختیار کرنے والوں کا قول نقل ہوا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ﴾

''اور کفر کرنے والے کہتے ہیں کہ ہم نہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور نہ اس سے پہلے والے پر۔''

یہاں تورات کے لیے بھی قرآن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ آگے ضعفاء اور منکرین کے مکالمے کا ذکر ہے — فرمایا: کاش تم دیکھ پاتے کہ یہ ظالم جب اپنے ربّ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو آپس میں مکالمہ کریں گے۔ نچلے طبقات کے دبے اور کچلے ہوئے لوگ استکبار اور گھمنڈ کی روش اختیار کرنے والے لوگوں سے کہیں گے کہ تم لوگ ہمیں ورغلاتے رہے' اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایمان لے آتے! جواب میں وہ ان ضعفاء سے کہیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ایمان لانے اور ہدایت کی روش اختیار کرنے سے روکا تھا؟ تم تو خود ہی مجرم تھے۔ پھر وہ ضعیف اور کمزور لوگ ان متکبّرین سے کہیں گے کہ تمہاری تو ہر وقت یہ چال تھی' تم ہمیں حکم دے رہے تھے کہ ہم کفر کریں اور اللہ کے مدمقابل کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ پھر جب یہ سب لوگ عذاب کو اپنے سامنے دیکھیں گے تو اپنی ندامت کو اندر ہی اندر چھپائیں گے اور ہم ان کے گلوں میں ان کے عمل کی پاداش میں طوق ڈال دیں گے۔ (آیات ۳۱۔۳۳)

آیت ۳۷ میں مال اور اولاد کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ چیزیں تمہیں ہم سے قریب کرنے والی نہیں ہیں' ہاں اگر ایمان اور عملِ صالح کی بنیاد مضبوط ہے تو پھر یہ بھی ذریعہ تقرب بن سکتے ہیں۔ صالح اولاد سے بڑا صدقہ جاریہ اور کوئی نہیں ہے۔ اگر انسان اپنے پیچھے نیک اولاد چھوڑ کر مرے تو اس کے لیے نیکیوں کا ایک سلسلہ جاری رہے گا۔

آیت ۴۰'۴۱ میں ملائکہ پرستی کی نفی کی گئی ہے۔ فرمایا: ''اور جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے کہے گا: کیا یہ لوگ تم کو پوجا کرتے تھے؟ تو وہ عرض کریں گے کہ تیری ذات پاک ہے' ہمارا تعلق تو تجھ سے ہے نہ کہ ان لوگوں سے۔''

چھٹے رکوع میں بہت اہم انداز اختیار کیا گیا: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ.....﴾

''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ میں تم کو صرف ایک بات سمجھاتا ہوں کہ تم محض اللہ کے واسطے کھڑے ہو جاؤ' دو دو اور ایک ایک کر کے' پھر ذرا سوچو (کہ تمہاری محفلوں میں جس بات کا چرچا ہے کیا وہ صحیح ہو سکتی ہے؟) تمہارے رفیق (نبی مکرم ﷺ) کو کوئی جنون لاحق نہیں ہے' یہ تو تمہیں ایک بڑے عذاب کے آنے سے پہلے خبردار کرنے والے ہیں۔ اور (اے نبی ﷺ) آپ فرما دیجیے کہ اگر میں نے تم سے (تبلیغ رسالت پر) کوئی اجرت طلب کی ہو تو وہ تم ہی کو مبارک ہو' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے جو ہر چیز پر نگران ہے۔ ان سے کہہ دیجیے کہ میرا ربّ حق کو (باطل کے سر پر) کھینچ مارتا ہے اور وہ غیب کی باتوں کو

خوب جانتا ہے۔ان سے کہہ دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل نہ پہل کرے اور نہ پھر آئے۔ان سے کہیے کہ اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو اس کا وبال مجھ پر ہی آئے گا اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس کی وجہ وحی ہے جو اللہ کی طرف سے مجھ پر آتی ہے۔وہ یقیناً سب کچھ سننے والا اور قریب ہے۔'' (آیات ۴۳تا۵۰)

سُورۂ فاطر

یہ سورۂ مبارکہ پانچ رکوعوں پر مشتمل ہے اور یہ غالباً مکہ کے درمیانی دور میں نازل ہوئی ہے' جبکہ نبی اکرم ﷺ کی مخالفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی اور آپؐ کی دعوت کو ناکام بنانے کے لیے ہر طرح کی بری سے بری چالیں چلی جا رہی تھیں۔اس سورۃ کا آغاز بھی الحمد للّٰہ کے مبارک کلمات سے ہوا ہے اور اس کے مضامین سابقہ سورۃ یعنی سورۂ سبا کے مضامین سے گہری مشابہت رکھتے ہیں۔ پہلے رکوع میں توحید' رسالت اور معاد' جو بنیادی ایمانیات ہیں' بڑی جامعیت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

توحید کا لُبِ لُباب یہ ہے کہ انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ کے اِذن سے ہوتا ہے اور تمام خیر و شر اسی کے ہاتھ میں ہے۔یہی بات آیت ۲ میں بیان ہوئی ہے:

﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲﴾

''اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے اپنی جس رحمت کا دروازہ بھی کھولنا چاہے تو اس کا روکنے والا کوئی نہیں' اور جو کچھ وہ روک دے تو اسے اللہ کے بعد کوئی بھیجنے والا نہیں۔اور وہ غالب' حکمت والا ہے۔''

اگلی چار آیات میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کا بیان فرما رہا ہے۔دوسری آیت میں نبی ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ صرف آپ ہی کو نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ آپ سے پہلے آنے والے بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں۔اس کے بعد قیامت کے حوالہ سے بتایا گیا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور یہ اپنے وقت پر آ کر رہے گی۔ یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالنے پائے اور انتہائی دھوکے باز شیطان تمہیں اس مغالطہ میں مبتلا کر کے جری نہ بنا دے کہ گناہوں سے بچنے کی کیا ضرورت ہے' جبکہ اللہ بڑا غفور و رحیم اور نکتہ نواز ہے۔یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے' اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔وہ تو لوگوں کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کی تگ و دو کر رہا ہے تاکہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں!

دوسرے رکوع میں آنحضور ﷺ سے ارشاد ہو رہا ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے حال پر حسرت و افسوس اور رنج و غم کی وجہ سے اپنی جان ضائع نہ کیجیے۔جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ خوب جانتا ہے۔

اس رکوع میں ایک اہم قانونِ فطرت بھی بیان ہوا ہے: ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ﴾ ''اُس کی طرف چڑھتے ہیں پاک کلمات اور نیک اعمال ان کو بلند کرتے ہیں''۔یعنی کلمہ طیبہ تو دعوتِ حق ہے اور اس کو بلند کرنے والی شے عملِ صالح ہے۔اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس قانون پر بنائی ہے کہ حق کے لیے بھی اہل حق کو محنت کرنی پڑے گی' قربانیاں دینی پڑیں گی۔چنانچہ اعمالِ صالحہ کے بغیر کلماتِ طیبات پوری رفعت شان حاصل نہیں کر سکتے۔

تیسرے رکوع میں ابتدائی طور پر قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اُس روز ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوگا' کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہ ہوگا' خواہ کوئی عزیز ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ تو صرف ایسے لوگوں کو خبردار کر سکتے ہیں جو غیب میں ہوتے ہوئے بھی تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کوئی اپنا تزکیۂ نفس کرتا ہے تو اپنے ہی بھلے کو کرتا ہے (کہ اُس سے اس کی اپنی سیرت و کردار کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔) اور اللہ ہی کی طرف لوٹ جانا ہے۔ دیکھو! نہ تو اندھے اور آنکھوں والے برابر ہیں' نہ تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہیں' نہ ہی سایہ اور تپتی دھوپ یکساں ہیں' اور نہ ہی زندہ اور مردہ برابر ہیں۔ پھر فرمایا کہ اللہ جس کو چاہتا ہے سنوا دیتا ہے' اور اے نبی ﷺ آپ نہیں سنا سکتے ان کو جو قبروں میں ہیں۔ آپ تو بس ایک خبردار کرنے والے ہیں۔ (یہاں مردہ سے مراد وہ نہیں ہیں جو مر کر دفن ہو چکے ہوں بلکہ یہاں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو اصل میں ہیں تو زندہ' چلتے پھرتے ہیں' دیکھتے اور سنتے ہیں' لیکن ان کی روح اندر سے مردہ ہو چکی ہے اور ان کے قلب گویا مقبروں کے اندر دفن ہو چکے ہیں۔) آگے فرمایا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾

''ہم نے آپؐ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر۔ اور کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ بھیجا گیا ہو۔''

آیت ۲۸ میں ایک بہت اہم جملہ آیا ہے: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰۗؤُا ﴾ ''اللہ کی صحیح خشیت ان ہی بندوں میں ہوتی ہے جو صاحبِ علم ہوں''۔ یہاں علم کا جو مقام از روئے قرآن ہے وہ سامنے آتا ہے۔ علم کے حوالے سے یہ نوٹ کر لیں کہ علم کی دو قسمیں ہیں: علم الابدان اور علم الادیان۔ اگر انسان کی نظر محض علم الابدان یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی پر ہی جمی رہے تو یہ دجّالی فتنہ بن جاتی ہے' لیکن اگر انسان کے سامنے فطرت کے کسی مظہر (phenomenon) کا انکشاف ہو تو اللہ کی صناعی' اُس کی خلّاقی اور اُس کی قدرت دیکھ کر اس کے دل میں اللہ کی عظمت کا اضافہ ہو جائے تو یہ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰۗؤُا ﴾ کی مطلوب کیفیت ہے۔

آیت ۲۹ میں قرآن حکیم کی تلاوت کرنے' نماز قائم کرنے اور اللہ کی راہ میں چھپے اور اعلانیہ خرچ کرنے والوں کے بارے میں ارشاد ہوا کہ یہ لوگ امیدوار ہیں ایسی تجارت کے جس میں نفع ہی نفع ہے اور گھاٹے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو نہ صرف پورا پورا اجر دے گا بلکہ اپنے فضل سے اس سے بھی زیادہ عطا فرمائے گا۔

آیت ۳۱ میں نبی مکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ جو کتاب ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے وہی حق ہے اور وہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ آیت ۳۲ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں اُمّت مُسلمہ کے افراد کی تین اقسام بیان کر دی گئی ہیں:

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴾

''پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے اُن لوگوں کو اس کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو ہم نے منتخب فرمایا۔ پھر ان میں سے بعض تو اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہیں' اور بعض ان میں سے متوسط درجے کے ہیں' اور بعض ان میں

(باقی صفحہ 19 پر)

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورة النساء

آیات ۱۔۲

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ
مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ
اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

ح و ب

حَابَ يَحُوْبُ (ن) حَوْبًا: کسی جرم کا ارتکاب کرنا' گنہگار ہونا۔

حُوْبٌ (اسم ذات): جرم' گناہ۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''وَاتَّقُوْا'' کا مفعولِ اوّل ''اَللّٰهَ'' ہے اور ''اَلْاَرْحَامَ'' مفعولِ ثانی ہے۔ ''تَسَآءَلُوْنَ'' دراصل ''تَتَسَاءَلُوْنَ'' ہے۔ ''كَانَ'' کی خبر ہونے کی وجہ سے ''رَقِيْبًا'' حالتِ نصبی میں ہے۔

ترجمہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ: اے لوگو!
اتَّقُوْا: تم تقویٰ اختیار کرو
رَبَّكُمُ: اپنے ربّ کا
الَّذِيْ: جس نے
خَلَقَكُمْ: پیدا کیا تم کو
مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: ایک ہی جان سے

وَّخَلَقَ :اور(اس نے) پیدا کیا
زَوْجَهَا :اس کا جوڑا
مِنْهُمَا :ان دونوں سے
وَّنِسَآءً :اور عورتیں
اللّٰهَ الَّذِیْ :اس اللہ (کی ناراضگی) سے
بِهٖ :جس (کے حوالے) سے
اِنَّ :یقیناً
كَانَ :ہے
رَقِیْبًا :نگران
الْیَتٰمٰٓی :یتیموں کو
وَلَا تَتَبَدَّلُوا :اور تم مت بدلو
بِالطَّیِّبِ :پاکیزہ سے
اَمْوَالَهُمْ :ان کے مال
اِنَّهٗ :یقیناً یہ
حُوْبًا كَبِیْرًا :ایک بڑا جرم

مِنْهَا :اس سے
وَبَثَّ :اور (اس نے) پھیلائے
رِجَالًا كَثِیْرًا :بہت سے مرد
وَاتَّقُوا :اور تم بچو
تَسَآءَلُوْنَ :تم لوگ باہم مانگتے ہو
وَالْاَرْحَامَ :اور رشتہ داروں (کی حق تلفی) سے
اللّٰهَ :اللہ
عَلَیْكُمْ :تم پر
وَاٰتُوا :اور تم پہنچاؤ
اَمْوَالَهُمْ :ان کے مال
الْخَبِیْثَ :گندے کو
وَلَا تَاْكُلُوْٓا :اور تم مت کھاؤ
اِلٰٓی اَمْوَالِكُمْ :اپنے مالوں میں شامل کر کے
كَانَ :ہے

نوٹ: كَانَ کا ترجمہ ''تھا'' کے بجائے ''ہے'' کیا گیا ہے' کیونکہ یہاں آفاقی صداقت کا بیان ہے۔ اسی طرح ''لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ'' کا ترجمہ قاعدے کے مطابق کیا گیا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ بدلے میں جو لیتے ہیں وہ بِنَفْسِهٖ آتا ہے اور جو دیتے ہیں اس پر ''بِ'' کا صلہ آتا ہے۔ لیکن یہاں معنی مراد یہ نہیں ہے کہ یتیم کے مال میں سے گندی چیز لے کر اس کی جگہ پاکیزہ چیز مت رکھو' بلکہ مراد اس کے برعکس ہے۔ مفسرین نے اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ یتیم کے مال سے اچھی سمجھ کر جو چیز لو گے وہ تمہارے لیے حرام ہے' اس لیے گندی ہے اور اپنی جو ناکارہ چیز اس کی جگہ رکھو گے وہ تمہارے لیے حلال ہے' اس لیے پاکیزہ ہے۔

آیات ۳ تا ۵

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ﴿۳﴾ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ﴿۴﴾ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾

ع و ل

عَالَ يَعُوْلُ (ن) عَوْلًا :(۱) ناانصافی کرنا (۲) بوجھل ہونا' عیال دار ہونا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ن ح ل

نَحَلَ يَنْحَلُ (ف) نَحْلًا :کسی کو کوئی چیز خوشی سے دینا۔

نِحْلَةٌ (اسم ذات) :(۱) عطیہ' تحفہ۔ (۲) خوشدلی۔ آیت زیر مطالعہ۔

نَحْلٌ :شہد کی مکھی ۔﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ (النحل:٦٨) ''اور الہام کیا تیرے ربّ نے شہد کی مکھی کی طرف۔''

ھ ن ء

هَنَى يَهْنِئُ (ف) هِنَاءٌ :کھانے کا خوشگوار ہونا۔

هَنِيْءٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت):ہمیشہ اور ہر حال میں خوشگوار۔ آیت زیر مطالعہ۔

م ر ء

مَرَءَ يَمْرَءُ (ف) مَرْءًا :کھانے کا مفید ہونا۔

مَرِئٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت) :ہمیشہ اور ہر حال میں مفید۔ آیت زیر مطالعہ۔

مَرِءَ يَمْرَءُ (س) مَرَءًا :زنانہ طرز کا ہونا۔

مَرُءَ يَمْرُءُ (ک) مُرُوْءَةً : مروت والا ہونا۔

مَرْءٌ (اسم ذات) :(۱) انسان (جس میں عورت اور مرد دونوں شامل ہیں) (۲) آدمی' مرد۔ ﴿يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ﴾ (النبا:٤٠) ''جس دن دیکھے گا انسان اس کو جو آگے بھیجا اس کے دونوں ہاتھوں نے''۔ ﴿مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ﴾ (البقرۃ:١٠٢) ''وہ جدائی ڈالتے ہیں جس سے مرد اور اس کی بیوی کے مابین۔''

امْرُؤٌ (حالتِ نصبی امْرَءًا ۔حالتِ جری امْرِئٍ۔شروع میں ہمزۃ الوصل ہے) (اسم ذات):(۱) انسان ۔(۲) آدمی' مرد۔ ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ﴾ (النور:١١) ''ہر انسان کے لیے ان میں سے وہ ہے جو اس نے کمایا گناہ میں سے''۔ ﴿اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ﴾ (النساء:١٧٦) ''اگر کوئی مرد ہلاک ہوا''۔ ﴿مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ﴾ (مریم:٢٨) ''نہیں تھا تیرا باپ کوئی بُرا آدمی۔''

اِمْرَاَةٌ ج نِسَاءٌ اور نِسْوَةٌ (اس میں بھی ہمزۃ الوصل ہے) (اسم ذات):عورت ﴿وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ﴾ (القصص:٩) ''اور کہا فرعون کی عورت نے''۔ ﴿وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ﴾ (یوسف:٣٠) ''اور کہا کچھ عورتوں نے اس شہر میں۔''

ترکیب:''اَلَّا'' دراصل ''اَنْ لَّا'' ہے۔ ''يَتِيْمٌ'' واحد اور اس کی جمع ''يَتٰمٰى'' مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے آتا ہے۔ یہاں ''يَتِيْمٌ'' لڑکیاں مراد ہیں۔ ''فَوَاحِدَةً'' کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ فعل محذوف کا مفعول ہے۔

یعنی یہ ''فَانْکِحُوْا وَاحِدَۃً'' ہے۔ ''نِحْلَۃً'' حال ہے۔ ''مِنْہُ'' کی ضمیر ''صَدُقٰتٍ'' کے لیے ہے۔ ''ھَنِیْئًا مَّرِیْئًا'' حال ہے ''کُلُوْہُ'' کی ضمیر مفعولی کا جو ''شَیْءٍ'' کے لیے ہے۔ ''جَعَلَ'' کا مفعول ''الَّتِیْ'' ہے۔

ترجمہ:

وَاِنْ :اوراگر
اَلَّا تُقْسِطُوْا :کہ تم انصاف نہیں کرسکو گے
فَانْکِحُوْا :تو تم نکاح کرو
طَابَ :پسندیدہ ہوں
مِّنَ النِّسَآءِ :عورتوں میں سے
وَثُلٰثَ :اور تین تین
فَاِنْ :پھر اگر
اَلَّا تَعْدِلُوْا :کہ تم برابری نہیں کرسکو گے
اَوْ مَا :یا اس سے جس کے
اَیْمَانُکُمْ :تمہارے داہنے ہاتھ
اَدْنٰٓی :زیادہ قریب ہے
وَاٰتُوا :اور تم ادا کرو
صَدُقٰتِھِنَّ :ان کے حق مہر
فَاِنْ :پھر اگر
لَکُمْ :تمہارے لیے
مِّنْہُ :اس میں سے
فَکُلُوْہُ :تو تم کھاؤ اس کو
مَّرِیْئًا :مفید ہوتے ہوئے
السُّفَھَآءَ :نادانوں کو
الَّتِیْ :جن کو
اللّٰہُ :اللہ نے
قِیٰمًا :کھڑے ہونے کا ذریعہ (معیشت میں)
فِیْھَا :اس میں سے
وَقُوْلُوْا :اور کہو
قَوْلًا مَّعْرُوْفًا :بھلی بات

خِفْتُمْ :تمہیں خوف ہو
فِی الْیَتٰمٰی :یتیم (لڑکیوں) میں
مَا :ان سے جو
لَکُمْ :تمہارے لیے
مَثْنٰی :دو دو
وَرُبٰعَ :اور چار چار
خِفْتُمْ :تمہیں خوف ہو
فَوَاحِدَۃً :تو پھر (نکاح کرو) ایک سے
مَلَکَتْ :مالک ہوئے
ذٰلِکَ :یہ
اَلَّا تَعُوْلُوْا :کہ تم لوگ ناانصافی نہ کرو
النِّسَآءَ :عورتوں کو
نِحْلَۃً :خوش دلی سے
طِبْنَ :وہ (خواتین) پسند کریں
عَنْ شَیْءٍ :کوئی چیز (دینا)
نَفْسًا :اپنے آپ
ھَنِیْئًا :خوشگوار ہوتے ہوئے
وَلَا تُؤْتُوا :اور تم مت دو
اَمْوَالَکُمُ :اپنے مال
جَعَلَ :بنایا
لَکُمْ :تمہارے لیے
وَّارْزُقُوْھُمْ :اور رزق دو ان کو
وَاکْسُوْھُمْ :اور پہناؤ ان کو
لَھُمْ :ان سے

نوٹ ۱: مادہ ''ص دق'' کی لغت البقرۃ: ۲۳ میں دی گئی ہے۔ وہاں لفظ ''صَدُقَۃٌ'' رہ گیا تھا۔ اس کے معنی ہیں بیوی کا حق مہر۔ اس کی جمع ''صَدُقَاتٌ'' ہے۔ اسی طرح مادہ ''ق وم'' کی لغت الفاتحہ: ۵ میں دی گئی ہے۔ وہاں لفظ ''قِیَامٌ'' رہ گیا تھا۔ یہ مصدر بھی ہے اور اسم الفاعل ''قَائِمٌ'' کی جمع بھی ''قِیَامٌ'' آتی ہے۔ جیسے ﴿سُجَّدًا وَّقِیَامًا ۝﴾ (الفرقان) ''سجدے کرنے والے ہوتے ہوئے اور کھڑے ہونے والے ہوتے ہوئے''۔ اس کے علاوہ ''قِیَامٌ'' اسم ذات بھی ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ چیز جس پر کھڑا ہوا جائے۔ جیسے کِتَابٌ وہ چیز جس پر لکھا جائے۔ یہاں مال کے حوالے سے قِیَامًا آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے معاشی لحاظ سے جس پر کھڑا ہو یعنی معیشت کا ذریعہ۔

نوٹ ۲: زیر مطالعہ آیت ۳ میں بیک وقت چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن ایک سے زیادہ شادی کی مخالفت کرنے والے جدید تعلیم یافتہ لوگ بھی اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ یہ اجازت مخصوص حالات میں مخصوص لوگوں کے لیے ہے اور چار شادیاں کرنے کی عام اجازت اسلام میں کہیں نہیں ہے۔ اس مسئلہ کو ایک مثال سے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ روزوں کے متعلق جب یہ آیت اتری کہ تم لوگ کھاؤ پیو یہاں تک کہ سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے واضح ہو جائے (البقرۃ: ۱۸۷) تو ایک صحابی سحری کے وقت سیاہ اور سفید دھاگے کو دیکھا کرتے۔ جب رنگوں کا فرق واضح ہو جاتا تو کھانا بند کر دیتے۔ حضور ﷺ نے انہیں سمجھایا کہ صاحب کلام یعنی اللہ تعالیٰ کی اس آیت سے یہ مراد نہیں ہے۔ اس مثال کے حوالے سے یہ اصول ذہن نشین کر لیں کہ قرآن مجید کی کسی آیت کے اور خاص طور سے عملی ہدایات والی آیات کے جو معانی رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیان کیے ہیں' وہ ہمارے لیے حرفِ آخر ہیں۔ جب اہل زبان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ صرف آیات کے الفاظ سے وہ اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی معلوم کر لیں تو پھر ہم کس قطار شمار میں ہیں؟

متعدد احادیث اور اقوالِ صحابہؓ سے اس آیت کے معنی مراد کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت نہ صرف عرب بلکہ پوری دنیا میں کثرتِ ازواج کا رواج تھا۔ اس آیت میں اس کی حد بندی کی گئی ہے۔ چار سے زیادہ شادیاں کرنے پر پابندی عائد کی گئی ہے اور چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ چوتھی اور تیسری شادی تو دور کی بات ہے ہم تو وہ لوگ ہیں جو دوسری شادی کو بھی بہت بُرا سمجھتے ہیں' اس لیے عائلی قوانین میں اس پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اس درخت کا پھل یہ سامنے آیا کہ آج اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اسلامی معاشرے میں لیڈی سیکرٹری یا گرل فرینڈ رکھنا رواج کی بات ہے' داشتہ رکھنا تو کمال کی بات ہے' لیکن دوسری شادی کرنا معاشرتی عذاب کی بات ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ! ع ''حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!''

آیت ۶

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ

كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝

ب د ر

بَدَرَ يَبْدُرُ (ن) بُدُوْرًا : کام میں جلدی کرنا۔

بَدْرٌ (اسم علم) : مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مشہور جگہ کا نام جہاں جنگ بدر ہوئی تھی۔

بَادَرَ يُبَادِرُ (مفاعلہ) بِدَارًا : کسی کام کو وقت سے پہلے کرنا' عجلت کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''اٰنَسْتُمْ'' کا مفعول ''رُشْدًا'' ہے۔ ''لَا تَاْكُلُوْهَا'' کا مفعول ''هَا'' کی ضمیر ہے جبکہ ''اِسْرَافًا'' اور ''بِدَارًا'' حال ہیں۔ ''غَنِيًّا'' اور ''فَقِيْرًا'' ''كَانَ'' کی خبریں ہیں۔ ''فَاَشْهِدُوْا'' کا مفعول محذوف ہے۔ ''عَلَيْهِمْ'' متعلق فعل ہے اور اس میں ''هُمْ'' کی ضمیر ''الْيَتٰمٰى'' کے لیے ہے۔ ''بِاللّٰهِ'' پر ''بَا'' خوبی کلام کے لیے ہے' البتہ اپنے لفظی معنی سے مبرّیٰ ہے اور یہ ''كَفٰى'' کا فاعل ہے۔ ''حَسِيْبًا'' حال یا تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہوا ہے۔

ترجمہ:

وَابْتَلُوا : اور تم آزمایا کرو	الْيَتٰمٰى : یتیموں کو
حَتّٰٓى : یہاں تک کہ	اِذَا : جب
بَلَغُوا : وہ پہنچیں	النِّكَاحَ : نکاح (کی عمر) کو
فَاِنْ : پھر اگر	اٰنَسْتُمْ : تم پاؤ
مِّنْهُمْ : ان میں	رُشْدًا : کچھ معاملہ فہمی
فَادْفَعُوْٓا : تو لوٹاؤ	اِلَيْهِمْ : ان کی طرف
اَمْوَالَهُمْ : ان کے مال	وَلَا تَاْكُلُوْهَآ : اور مت کھاؤ اس کو
اِسْرَافًا : ضرورت سے زیادہ ہوتے ہوئے	وَّبِدَارًا : اور عجلت کرتے ہوئے
اَنْ : کہ (کہیں)	يَّكْبَرُوْا : وہ بڑے ہو جائیں
وَمَنْ : اور جو	كَانَ : ہے
غَنِيًّا : مالدار	فَلْيَسْتَعْفِفْ : تو اسے چاہیے کہ وہ باز رہے
وَمَنْ : اور جو	كَانَ : ہے
فَقِيْرًا : محتاج	فَلْيَاْكُلْ : تو اسے چاہیے کہ وہ کھائے
بِالْمَعْرُوْفِ : دستور کے مطابق	فَاِذَا : پھر جب
دَفَعْتُمْ : تم لوٹاؤ	اِلَيْهِمْ : ان کی طرف
اَمْوَالَهُمْ : ان کے مال	فَاَشْهِدُوْا : تو گواہ بناؤ

عَلَيۡهِمۡ : ان پر　　وَكَفٰى : اور کافی ہے

بِاللّٰهِ : اللہ　　حَسِيۡبًا : حساب لینے والا

نوٹ ۱: ماقبل آیت ۵ میں ہدایت ہے کہ نادانوں کو اپنے مال مت دو۔ اس میں اَلسُّفَهَآءُ کے لفظ میں عمومیت ہے۔ پھر اَمۡوَالَهُمۡ نہیں کہا بلکہ اَمۡوَالَكُمۡ کہا ہے۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ ان کے مال مت دو' بلکہ کہا ہے کہ اپنے مال مت دو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ ہدایت یتیموں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ عام ہے' خواہ وہ اپنے بچے ہوں یا یتیم ہوں۔ ہدایت یہ ہے کہ بچوں کو پیسہ دینے کے بجائے ان کی ضرورت کی اشیاء فراہم کرو۔

اس آیت سے بچوں کو جیب خرچ دینے کی ممانعت کا جواز پیدا کرنا میرے خیال میں درست نہیں ہے' کیونکہ اس طرح بچوں کی مالی معاملات میں تربیت کرنے اور ان میں معاملہ فہمی پیدا کرنے کا عمل رک جائے گا۔ البتہ اس آیت سے یہ راہنمائی ضرور حاصل ہوتی ہے کہ ضروریات فراہم کرنے کے ساتھ جیب خرچ دینے میں احتیاط کی جائے اور کھلا جیب خرچ نہ دیا جائے۔ نیز اس بات کی نگرانی ضرور کی جائے کہ بچے اپنا جیب خرچ کہاں اور کیسے خرچ کرتے ہیں۔ اس طرح جیب خرچ کو ان کی مالی تربیت کا ذریعہ بنایا جائے۔

نوٹ ۲: اپنے بچوں کی تربیت کے لیے تو عموماً ہر شخص فکر مند ہوتا ہے۔ اس لیے آیت زیر مطالعہ میں یتیموں کا خصوصیت سے ذکر کر کے ہدایت دی کہ بچوں کے بالغ ہونے سے پہلے تک ان کو آزماتے رہو' کیونکہ آزمائش تربیت کا جزو لاینفک ہے۔ مالی تربیت میں آزمائش کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے خرید و فروخت کے معاملات ان کے سپرد کر کے ان کی صلاحیت کا امتحان لیتے رہو اور ان کی ذہنی بلوغت کا اندازہ کرتے رہو۔

نوٹ ۳: یتیموں کا مال ان کے حوالے کرنے کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں۔ ایک بلوغت اور دوسرا رشد۔ رُشۡدًا کا لفظ نکرہ لا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ مکمل دانشمندی شرط نہیں ہے' بلکہ کسی قدر ہوشیاری بھی اس کے لیے کافی ہے کہ یتیموں کے مال ان کے حوالے کر دیے جائیں۔

دوسری شرط کے متعلق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ سنِ بلوغ کو پہنچنے پر اگر یتیم میں رشد نہ پایا جائے تو اس کے ولی کو زیادہ سے زیادہ سات سال اور انتظار کرنا چاہیے۔ پھر خواہ رُشد پایا جائے یا نہ پایا جائے' اس کا مال اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ مال حوالے کرنے کے لیے بہر حال رُشد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ مولانا مودودیؒ کی رائے ہے کہ ایسی صورت میں قاضی سے رجوع کیا جائے اور اگر قاضی پر ثابت ہو جائے کہ اس میں رشد نہیں پایا جاتا تو وہ اس کے معاملات کی نگرانی کے لیے کوئی مناسب انتظام کر دے۔

آیات ۷ تا ۱۰

لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ ۖ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ مِمَّا قَلَّ مِنۡهُ اَوۡ كَثُرَ ؕ نَصِيۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ۞ وَاِذَا حَضَرَ الۡقِسۡمَةَ اُولُوا الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنُ فَارۡزُقُوۡهُمۡ مِّنۡهُ وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۞ وَلۡيَخۡشَ الَّذِيۡنَ لَوۡ تَرَكُوۡا

مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝

ق س م

قَسَمَ يَقْسِمُ (ض) **قَسْمًا** : کسی چیز کے حصے کرنا اور بانٹ دینا' تقسیم کرنا۔ ﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ﴾ (الزخرف:۳۲) ''کیا یہ لوگ بانٹتے ہیں تیرے رب کی رحمت کو۔''

مَقْسُوْمٌ (اسم المفعول) : تقسیم کیا ہوا' بٹا ہوا۔ ﴿لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝﴾ (الحجر) ''ان میں سے ہر ایک دروازے کے لیے ایک بٹا ہوا حصہ ہے۔''

قِسْمَةٌ (اسم فعل) : بانٹ' تقسیم۔ آیت زیر مطالعہ۔

قَسَمٌ (اسم ذات) : اولیاء مقتول پر تقسیم کیا جانے والا حلف۔ پھر ہر حلف اور قسم کے لیے آتا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝﴾ (الواقعة) ''اور یقیناً یہ ایک عظیم قسم ہے' اگر تم سمجھو۔''

اَقْسَمَ يُقْسِمُ (افعال) **اِقْسَامًا** : حلف اٹھانا' قسم کھانا۔ ﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ﴾ (الانعام:۱۰۹) ''اور انہوں نے قسم کھائی اللہ کی اپنے حلف کی کوشش کرتے ہوئے۔''

قَسَّمَ يُقَسِّمُ (تفعیل) **تَقْسِيْمًا** : بتدریج بانٹنا۔

مُقَسِّمٌ (اسم الفاعل) : بانٹنے والا۔ ﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝﴾ (الذاریات) ''پھر قسم ہے حکم کو بانٹنے والیوں کی۔''

قَاسَمَ يُقَاسِمُ (مفاعلہ) **مُقَاسَمَةً** : دوسرے کو قسم دینا۔ ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝﴾ (الاعراف) ''اور اس نے قسم دی ان دونوں کو کہ یقیناً میں تم دونوں کے لیے نصیحت کرنے والوں میں سے ہوں۔''

تَقَاسَمَ يَتَقَاسَمُ (تفاعل) **تَقَاسُمًا** : ایک دوسرے سے قسم لینا۔

تَقَاسَمْ (فعل امر) : ایک دوسرے سے قسم لو ﴿قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ﴾ (النمل:۴۹) ''انہوں نے کہا تم لوگ ایک دوسرے سے حلف لو کہ ہم لازماً شب خون ماریں گے اس پر (صالح علیہ السلام) اور اس کے گھر والوں پر۔''

اِقْتَسَمَ يَقْتَسِمُ (افتعال) **اِقْتِسَامًا** : اہتمام سے بانٹنا۔

مُقْتَسِمٌ (اسم الفاعل) : اہتمام سے بانٹنے والا۔ ﴿كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۝﴾ (الحجر) ''جیسا کہ ہم نے اُتارا اہتمام سے تقسیم کرنے والوں پر۔''

اِسْتَقْسَمَ يَسْتَقْسِمُ (استفعال) **اِسْتِقْسَامًا** : بانٹ چاہنا' تقسیم کرنے کی کوشش کرنا۔ ﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ﴾ (المائدۃ:۳) ''اور وہ جو ذبح کیا گیا استھان پر اور یہ کہ تم لوگ تقسیم کرنے کی کوشش کرو فال کے تیروں سے۔''

س د د

سَدَّ یَسُدُّ (ن) سَدًّا :کوئی رخنہ یا دراز بند کرنا' درست کرنا' دیوار یا آڑ کھڑی کرنا۔

سَدٌّ (اسم ذات) :دیوار' آڑ۔ ﴿وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا﴾ (یٰسٓ:۹) ''اور ہم نے بنایا ان کے سامنے ایک آڑ۔''

سَدِیْدٌ (فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت):درست' ٹھیک۔ آیت زیر مطالعہ۔

ص ل ی

صَلَی یَصْلِی (ض) صَلْیًا :کسی چیز کو آگ پر بھوننا' آگ میں ڈالنا۔

صَلِیَ یَصْلَی (س) صِلِیًّا :آگ کی تپش جھیلنا' آگ میں گرنا' آیت زیر مطالعہ۔

اِصْلَ (فعل امر) :تو جل۔ ﴿اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ (یٰسٓ) ''تم لوگ جلو اس میں آج بسبب اس کے جو تم انکار کیا کرتے تھے۔''

صَالٍ (اسم الفاعل) :جلنے والا۔ ﴿اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ﴾ (صٓ) ''بے شک یہ لوگ آگ میں جلنے والے ہیں۔''

اَصْلٰی یُصْلِیْ (افعال) اِصْلَاءً :کسی کو آگ میں داخل کرنا' گرانا۔ ﴿فَسَوْفَ نُصْلِیْهِ نَارًا﴾ (النساء:۳۰) ''تو عنقریب ہم داخل کریں گے اس کو آگ میں۔''

نُصْلِ (مضارع مجزوم میں جمع متکلم کا صیغہ) :﴿وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ﴾ (النساء:۱۱۵) ''اور ہم داخل کریں گے اس کو دوزخ میں۔''

صَلَّی یُصَلِّیْ (تفعیل) تَصْلِیَةً :کسی کو آگ میں بھوننا۔

صَلِّ (فعل امر) :تو بھون' تو جلا۔ ﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ۝﴾ (الحاقة) ''تم لوگ اس کو پکڑو پھر اسے طوق ڈالو۔ پھر بھڑکتی آگ میں اس کو بھونو۔''

اِصْطَلٰی یَصْطَلِیْ (افتعال) اِصْطِلَاءً:اہتمام سے جلنا' آگ تاپنا' سینکنا۔ ﴿اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝﴾ (النمل) ''یا میں لاؤں تمہارے پاس ایک سلگتا انگارہ شاید تم لوگ آگ تاپو۔''

س ع ر

سَعَرَ یَسْعَرُ (ف) سَعْرًا :(۱) کسی کو اشتعال دلانا' بھڑکانا۔ (۲) آگ جلانا۔

سَعِیْرٌ (فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت) :ہمیشہ جلنے والی آگ' شعلوں والی آگ۔ آیت زیر مطالعہ۔

سُعُرٌ :دیوانگی' پاگل پن' جنون۔ ﴿اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝﴾ (القمر) ''یقیناً مجرم لوگ گمراہی اور جنون میں ہیں۔''

سَعَّرَ یُسَعِّرُ (تفعیل) تَسْعِیْرًا :کثرت سے آگ جلانا' آگ کو خوب بھڑکانا۔ ﴿وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ ۝﴾ (التکویر) ''اور جب بھڑکتی آگ خوب بھڑکائی جائے گی۔''

ترکیب: ''تَرَكَ'' کا فاعل ''اَلْوَالِدَانِ'' اور ''اَلْاَقْرَبُوْنَ'' ہیں اور ''اَلْاَقْرَبُوْنَ'' اسم تفضیل ہے۔ ''تَرَكَ'' کا مفعول ''مِمَّا'' (مِنْ مَا) کا ''مَا'' ہے۔ ''نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا'' حال ہے۔ ''حَضَرَ'' کے فاعل ''اُولُو الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ'' ہیں۔ ''اَلْقِسْمَةَ'' ظرف ہونے کی وجہ سے حالت نصبی میں ہے۔ ''مِنْهُ'' کی ضمیر ''مِمَّا'' کے ''مَا'' کے لیے ہے۔ ''لَوْ تَرَكُوْا'' کا ''لَوْ'' شرطیہ ہے ''خَافُوْا'' اس کا جواب ہے۔ ''ذُرِّيَّةً'' اسم جمع ہے اس لیے اس کی صفت جمع مکسر آئی ہے۔ ''ظُلْمًا'' حال ہے۔

ترجمہ:

لِلرِّجَالِ : مَردوں کے لیے ہے	نَصِيْبٌ : ایک حصّہ
مِّمَّا : اس میں سے جو	تَرَكَ : چھوڑا
الْوَالِدٰنِ : ماں باپ نے	وَالْاَقْرَبُوْنَ : اور زیادہ قریبی رشتہ داروں نے
وَلِلنِّسَآءِ : اور عورتوں کے لیے ہے	نَصِيْبٌ : ایک حصہ
مِّمَّا : اس میں سے جو	تَرَكَ : چھوڑا
الْوَالِدٰنِ : ماں باپ نے	وَالْاَقْرَبُوْنَ : اور زیادہ قریبی رشتہ داروں نے
مِمَّا : اس میں سے جو	قَلَّ : کم ہو
مِنْهُ : اس سے	اَوْ : یا
كَثُرَ : زیادہ ہو	نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا : فرض کیا ہوا حصہ ہوتے ہوئے
وَاِذَا : اور جب	حَضَرَ : حاضر ہوں
الْقِسْمَةَ : تقسیم کے وقت	اُولُوا الْقُرْبٰى : قرابت والے
وَالْيَتٰمٰى : اور یتیم	وَالْمَسٰكِيْنُ : اور ضرورت مند لوگ
فَارْزُقُوْهُمْ : تو تم دو ان کو	مِّنْهُ : اس میں سے
وَقُوْلُوْا : اور کہو تم	لَهُمْ : ان سے
قَوْلًا مَّعْرُوْفًا : بھلی بات	وَلْيَخْشَ : اور چاہیے کہ ڈریں
الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو	لَوْ : اگر
تَرَكُوْا : چھوڑیں	مِنْ خَلْفِهِمْ : اپنے پیچھے
ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا : کچھ کمزور اولادیں	خَافُوْا : تو وہ خوف کریں
عَلَيْهِمْ : ان کے بارے میں	فَلْيَتَّقُوا : پس چاہیے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں
اللّٰهَ : اللہ کا	وَلْيَقُوْلُوْا : اور چاہیے کہ کہیں
قَوْلًا سَدِيْدًا : ٹھیک بات	اِنَّ الَّذِيْنَ : بے شک وہ لوگ جو
يَاْكُلُوْنَ : کھاتے ہیں	اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى : یتیموں کے مال

ظُلْمًا : ظلم کرتے ہوئے	اِنَّمَا : تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
يَاْكُلُوْنَ : وہ کھاتے (یعنی بھرتے) ہیں	فِيْ بُطُوْنِهِمْ : اپنے پیٹوں میں
نَارًا : ایک آگ	وَسَيَصْلَوْنَ : اور وہ گریں گے
سَعِيْرًا : شعلوں والی آگ میں	

نوٹ: مادہ ''ص ل و'' سے بابِ تفعیل کا فعل امر اصلاً صَلِّوْ بنتا ہے' جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر صَلِّ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں تو نماز پڑھ۔ مادہ ''ص ل ی'' سے بابِ تفعیل کا فعلِ امر اصلاً صَلِّیْ بنتا ہے' اور قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر یہ بھی صَلِّ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں تو آگ میں بھون۔ اس طرح دونوں ہم شکل ہو جاتے ہیں لیکن عبارت کے سیاق وسباق میں ان کی تمیز آسانی سے ہو جاتی ہے۔oo

---

بقیہ: مضامین قرآن

سے اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ یہی تو اللہ کا بڑا فضل ہے۔''

جنت میں داخلے کے وقت اہل جنت کی زبانوں پر جو ترانے ہوں گے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر ان کا ذکر ہوا ہے۔ ایسا ہی ایک ترانہ یہاں ملتا ہے:

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ۝ نِ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ۝﴾

''اور وہ کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے ہر قسم کا رنج وغم دور کر دیا۔ یقیناً ہمارا رب مغفرت والا اور قدر دان ہے۔ جس نے ہمیں اپنے فضل سے ایسی عمدہ قیام کی جگہ لا اتارا ہے جہاں ہمیں نہ مشقت پیش آئے اور نہ تکان لاحق ہو۔''

اس کے معاً بعد کافروں کا حال بیان ہوا ہے کہ وہ جہنم میں ہوں گے۔ نہ تو اُن کو قضا ہی آئے گی کہ وہ مر جائیں اور نہ اُن سے دوزخ کا عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔

آخری آیت میں ایک قانون کا تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر خطا کار کا اسی وقت فی الفور مواخذہ نہیں کرتا بلکہ اسے مہلت دیتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰي ظَهْرِهَا مِنْ دَاۗبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝﴾

''اور اگر اللہ مواخذہ (میں جلدی) کرتا بسبب ان کے گناہوں کے تو زمین پر کسی بھی حیوان کو نہ چھوڑتا' لیکن (اللہ) ان کو ڈھیل دیتا ہے وقت مقررہ تک۔ پھر جب وہ مقرر وقت آ گیا تو ان کا ربّ ان سے خوب واقف ہے۔''

یہ دھمکی کا انداز ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ تمہاری کوئی حرکت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔

تقویٰ کی فضیلت

مدرس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ؓ قَالَ لَمَّا بَعَثَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلَی الْیَمَنِ خَرَجَ مَعَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُوْصِیْهِ وَمُعَاذٌ رَاکِبٌ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَمْشِیْ تَحْتَ رَاحِلَتِهٖ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ :

((یَا مُعَاذُ اِنَّكَ عَسٰی اَنْ لَا تَلْقَانِیْ بَعْدَ عَامِیْ هٰذَا وَلَعَلَّكَ اَنْ تَمُرَّ بِمَسْجِدِیْ هٰذَا وَقَبْرِیْ)) فَبَكٰی مُعَاذٌ جَشَعًا لِفِرَاقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ الْتَفَتَ فَاَقْبَلَ بِوَجْهِهٖ نَحْوَ الْمَدِیْنَةِ فَقَالَ :((اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِیَ الْمُتَّقُوْنَ مَنْ كَانُوْا وَحَیْثُ كَانُوْا)) (رواہ احمد)

حضرت معاذ بن جبل ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کو یمن کے لیے (قاضی یا عامل بنا کر) روانہ فرمایا (اور وہ حضورؐ کے حکم کے مطابق وہاں کے لیے روانہ ہونے لگے) تو (ان کو رخصت کرنے کے لیے) حضور ﷺ بھی ان کو کچھ نصیحتیں اور وصیتیں فرماتے ہوئے ان کے ساتھ چلے' اس وقت حضرت معاذ ؓ تو (حضورؐ کے حکم سے) اپنی سواری پر سوار تھے' اور حضور ﷺ خود ان کی سواری کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ جب آپ (ضروری نصیحتوں اور وصیتوں سے) فارغ ہو چکے' تو آپ نے فرمایا:

''اے معاذ! شاید میری زندگی کے اس سال کے بعد ہماری ملاقات نہ ہو۔ (گویا آپ ﷺ نے ان کو اشارہ فرمایا کہ یہ میری زندگی کا آخری سال ہے اور میں عنقریب اس دنیا سے دوسرے عالم کی طرف منتقل کیا جانے والا ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا) اور شاید ایسا ہو کہ (جب کبھی تم یمن سے واپس آؤ' تو بجائے مجھ سے ملنے کے اس مدینہ میں) تم میری اس مسجد اور میری قبر پہ گزرو''۔ یہ سن کر حضرت معاذؓ (حضور ﷺ کی وفات کے تصور' اور) آپؐ کے فراق کے صدمہ سے رونے لگے' تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف سے منہ پھیر کے اور مدینہ کی طرف رخ کر کے فرمایا: ''مجھ سے زیادہ قریب اور مجھ سے زیادہ تعلق رکھنے والے وہ سب بندے ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں (اور تقوے والی زندگی گزارتے ہیں) وہ جو بھی ہوں' اور جہاں کہیں بھی ہوں۔''

حضرت معاذ بن جبل ؓ رسول اللہ ﷺ کے منظورِ نظر صحابہ میں سے تھے۔ وہ بیعت عقبہ ثانیہ کے ۷۲ افراد میں شامل تھے۔ آپ جنگ بدر میں شریک تھے اور بعد کے اکثر غزوات میں بھی آپ نے حصہ لیا۔ قرآن و حدیث کا عمدہ فہم رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو حلال اور حرام کا علم جاننے والا سب سے بڑا عالم قرار دیا۔ آپ ﷺ ترغیب دیتے تھے کہ لوگ حضرت معاذ ؓ سے قرآن مجید سیکھیں۔ دین کے معاملات میں

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُن کے مشوروں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تو آپؐ مشیر خاص تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا: اگر معاذ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوگیا ہوتا۔ ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کا حاکم بنا کر روانہ کیا اور نصیحت فرمائی کہ لوگوں کے لیے آسانی مہیا کرنا' مشکلات پیدا نہ کرنا۔ حضرت معاذ بڑے شیریں بیان اور خوش کلام صحابی تھے۔ ان سے ۱۵۷ حدیثیں مروی ہیں۔ ''اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ'' وہ مسنون دُعا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو سکھائی کہ فرض نمازوں کے بعد پڑھا کریں۔

اس حدیث میں اُس وقت کی منظر کشی کی گئی ہے جب ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کی طرف عامل بنا کر بھیجا۔ اس موقع پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ تو اپنی سواری پر سوار تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیادہ پا اُن کی سواری کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ تواضع اور انکساری اسلامی اخلاق کی محبوب صفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''بعد از خدا بزرگ توئی'' کے مقام پر فائز ہونے کے باوجود انتہائی متواضع تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے معمولی کام خود کر لیتے' صحابہ کے ساتھ سفر میں ہوتے تو دوسروں کے برابر کام کرتے۔ جنگِ احزاب کے موقع پر خندق کھودنے میں بھی صحابہ کے ساتھ کھدائی کا کام کیا۔ یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کو نمایاں کرنے کی بجائے تواضع کے ضمن میں بے مثال اُسوہ پیش کر رہے ہیں کہ معاذ رضی اللہ عنہ تو سواری پر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ ساتھ پیدل چل رہے ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ضرور کہا ہوگا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سواری پر سوار ہو جائیں اور میں پیدل چلتا ہوں مگر آپؐ نے اس بات کو قبول نہ کیا اور پیدل ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بات کرتے وقت اپنی رائے پر اصرار ہرگز نہ کرتے تھے بلکہ آپؐ کی رضا کو اپنی خواہش پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ جب آپؐ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی سواری کے ساتھ پیدل چلنا چاہا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے بھی اس بات کو مان لیا اور اصرار نہ کیا۔ اس میں اسلامی اخلاق کا ایک اور پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے کہ کسی کو رخصت کرتے وقت کچھ فاصلے تک اس کے ساتھ جانے میں جانے والے کی عزت افزائی اور اکرام بھی مسنون ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو ضروری پند و نصائح دے چکے تو پھر فرمایا کہ اے معاذ! شاید آج کے بعد میری تمہاری ملاقات نہ ہو۔ گویا آپؐ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ میں عنقریب عالم آخرت کی جانب منتقل کیا جانے والا ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ جب تم یمن سے واپس آؤ گے تو تمہاری ملاقات مجھ سے نہ ہوگی' بلکہ تم میری اس مسجد اور میری قبر سے گزرو گے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کی خبر سنا رہے تھے اس لیے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کے صدمے کا احساس کر کے رونے لگے۔ اس پر لگتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی اس کیفیت کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے تھے۔ آپؐ نے اپنا چہرہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف سے پھیر کر اپنا رُخ مبارک مدینہ کی طرف کر لیا تاکہ آپؐ کے آنسو دیکھ کر حضرت معاذ مزید پریشان نہ ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ اس خبر سے حضرت معاذ کو صدمہ پہنچا ہے' چنانچہ آپؐ نے اُن کو یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ میری وفات کے ساتھ میرے عقیدت مندوں اور جان نثاروں کو جو صدمہ ہوگا وہ وقتی ہوگا'

کیونکہ جب پرہیزگار لوگ حیاتِ دنیوی گزار کر عالم آخرت کی طرف مراجعت کریں گے تو ان کو وہاں میرا قرب نصیب ہو جائے گا۔ گویا آپؐ نے حضرت معاذؓ کو تسلی دی کہ اس ظاہری فراق کا غم نہ کرو' جب تمہارے دل میں خوفِ خدا اور تقویٰ ہوگا تو تم یمن میں رہتے ہوئے بھی مجھ سے دُور نہ ہو گے' بلکہ دارِ آخرت میں تو تم میرے ساتھ ہی ہو گے۔

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھ سے زیادہ قربت کا تعلق رکھنے والے وہ سب بندے ہوں گے جو اللہ سے ڈرتے ہوئے تقویٰ کی زندگی بسر کریں گے' وہ جو کوئی بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں۔ یعنی آخرت میں میری پائیدار صحبت کے حصول کا معیار تقویٰ ہے۔ یہ متقی لوگ چھوٹی ذات کے ہوں یا بڑی ذات کے' حاکم ہوں یا محکوم' امیر ہوں یا مفلس' خوشحال ہوں یا مفلوک الحال' عربی ہوں یا عجمی' تندرست ہوں یا معذور' کالے ہوں یا گورے' میرے ساتھ ہوں گے۔ پھر یہ متقی لوگ دنیا کے کسی خطے میں رہتے ہوں عرب میں ہوں یا عجم میں' قیامت کے دن ایسے لوگوں کو میری رفاقت نصیب ہوگی۔ حضرت معاذؓ کے ساتھ اس گفتگو میں گویا آپ ﷺ نے انتہائی جامع نصیحت فرمائی کہ دنیا میں زندگی اللہ تعالیٰ کے خوف میں گزاری جائے' ہر وہ کام کیا جائے جس کی آپ ﷺ نے تلقین کی ہے۔ فرائض دینی کو پوری استطاعت کے مطابق بجالایا جائے اور ہر اس کام سے باز رہا جائے' جس سے آپ ﷺ نے منع کیا ہے یا پسند نہیں کیا۔ نیز حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا بھی خیال رہے۔ یہی تقویٰ ہے اور ایسے ہی متقی لوگ اللہ کے ہاں معزز اور مکرم ہوں گے' جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (الحجرات:۱۳) ''بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے بڑھ کر متقی ہے''

حضرت معاذؓ ۹ھ کو یمن گئے اور ۱۱ھ میں رسول اللہ ﷺ کی رحلت ہوگئی۔ چنانچہ جب وہ ۱۱ھ میں واپس مدینہ آئے تو رسول اللہ ﷺ سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی اور اس وقت آپؐ کی تدفین ہو چکی تھی۔ اب حضرت معاذ کا آپؐ کی قبر سے ہی گزر ہوا' جس کی رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو خبر دی تھی۔

❁❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 25 روپے

نظریۂ وحدتُ الوجود اور ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

حافظ محمد زبیر

حال ہی میں بعض سلفی حضرات کی طرف سے نظریۂ وحدت الوجود کے حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ پر نقد سامنے آئی ہے' لیکن ہمارے خیال میں ناقدین میں سے کوئی ایک صاحب بھی ایسے نہیں ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے موقف کو پوری طرح سمجھے ہوں۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی خطا کا امکان ہے اور اس کی نفی ممکن نہیں ہے' لیکن کسی بھی شخص پر تنقید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ:

(۱) پہلے آپ اس شخص کے موقف کو اچھے طرح سمجھتے ہوں۔ عام طور پر مذہبی حلقوں کی طرف سے جو تنقیدیں ہوتی ہیں اس میں مدّ مقابل کے موقف کو سمجھے بغیر نقد کی جاتی ہے جو کہ کسی طور بھی مناسب طرزِ عمل نہیں ہے۔ بعض اوقات جس پر آپ نقد کر رہے ہوتے ہیں' اس کے اَفکار بہت واضح ہوتے ہیں اور ان افکار کو اُس شخص یا اس سے متعلّقہ افراد سے سمجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جب کسی موضوع پر کلام کرتا ہے تو وہ موضوع انتہائی دقیق' عمیق اور کچھ بنیادی اصطلاحات کا حامل ہوتا ہے اور عام افراد کے لیے اس کو سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے میں ناقد کو اُس شخص سے براہِ راست یا اس کے متعلّقین سے یہ وضاحت طلب کر لینی چاہیے کہ جیسے میں ان کا موقف سمجھا ہوں' کیا وہ یہی کہنا چاہتے ہیں؟ یا ان کی مراد کچھ اور ہے۔

(۲) تنقید کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ تنقید میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ کسی بھی داعی' مذہبی وسیاسی رہنما' عالم یا فقیہہ پر نقد کرتے ہوئے اس کی خوبیوں کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔ نقد کا بنیادی مقصد اصلاح و موعظت ہے' جبکہ فی زمانہ تنقید کا مقصد کسی کی شخصیت کو مسخ کرنا بن چکا ہے۔ وحدتُ الوجود کے مسئلہ میں سوائے ادارہ ''ایقاظ'' کے' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بھی اکثر ناقدین کا معاملہ یہی ہے کہ ان کی اصل کوشش شخصیت کو مسخ کرنے کی زیادہ معلوم ہوتی ہے' بجائے اس کے کہ ان کے سامنے کوئی اصلاح یا موعظت کا پہلو غالب ہو۔

بعض سلفی حضرات نے ڈاکٹر اسرار رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ وحدت الوجود اور شیخ ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کو ایک قرار دیا ہے اور اس بنیاد پر ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ پر شدید نقد کی ہے' حالانکہ دونوں کے نظریہ وحدت الوجود میں بنیادی اور جوہری فرق موجود ہے' جسے ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں:

شیخ ابن عربی کا موقف

محققین اہلِ علم کے مطابق وحدتُ الوجود کا نقطہ نظر سب سے پہلے شیخ ابن عربی (متوفی ۵۳۸ھ) نے ایک جامع فکر کی صورت میں پیش کیا' اگرچہ اس نظریہ کے منتشر تصوّرات ابن عربی سے پہلے بھی یونانی

فلاسفرز' باطنیہ' صوفیاء اور بعض فلاسفہ اسلامیین کے ہاں پائے جاتے رہے ہیں۔ ذیل میں ہم انتہائی اختصار کے ساتھ ممکن حد تک آسان الفاظ میں اس نظریہ کا ایک خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

فلسفہ اور فلاسفہ کا شروع ہی سے ایک بنیادی ذہنی خلجان یہ رہا ہے کہ ربط الحادث بالقدیم کے مسئلہ کو کیسے حل کیا جائے؟ اس مسئلے کا ایک حل تو قدیم فلاسفہ اور مناطقہ نے 'عقولِ عشرہ' اور 'اَفلاکِ تسعہ' کے تصورات کے ساتھ بیان کیا' جبکہ شیخ ابن عربی نے اس ربط کو اپنے نظریۂ وحدتُ الوجود کے ذریعے حل کیا ہے جس کی بنیادیں انہوں نے فرقہ باطنیہ سے حاصل کیں' جبکہ فرقہ باطنیہ نے یہ افکار یونانی فلسفے سے حاصل کیے تھے۔

شیخ ابن عربی نے قدیم سے حادث تک کے سفر کو 'تنزلاتِ ستہ' کے ذریعے بیان کیا ہے۔ صوفیاء کے ہاں چونکہ اصطلاحات کی بھرمار ہے لہٰذا انہوں نے اس تصور کو 'تنزلاتِ ستہ' کے علاوہ 'مراتبِ سبعہ' اور 'حضراتِ خمسہ' کے عناوین سے بھی پیش کیا اور ان عناوین کے تحت وہ وحدت الوجود کے علاوہ کچھ مزید تصورات کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ شیخ ابن عربی کے تنزلات کو جاننے سے پہلے یہ مقدمہ جاننا ضروری ہے کہ شیخ کے نزدیک ذات اور صفات کوئی الگ شئے نہیں ہیں بلکہ اَسماء وصفاتِ باری تعالیٰ بھی عین ذات ہی ہیں۔

شیخ ابن عربی کے نزدیک ذاتِ الٰہی سے پہلا تنزل 'حقیقتِ محمدیہ' میں ہوا ہے اور یہ تنزل اللہ تعالیٰ کی صفت علم میں ہوا ہے۔ دوسرا تنزل ان کے نزدیک 'حقیقتِ محمدیہ' سے 'اَعیانِ ثابتہ' میں ہوا ہے۔ اور تیسرا تنزل 'اَعیانِ ثابتہ' سے 'روح' میں ہوا ہے۔ چوتھا تنزل 'روح' سے 'مثال' میں اور پانچواں 'مثال' سے 'جسم' میں اور چھٹا 'جسم' سے 'انسان' میں ہوا ہے۔ ذیل میں ہم ان تنزلات کو ایک نقشے کی صورت میں واضح کرتے ہیں اور اس کے بعد بحث کو آگے بڑھاتے ہیں:

مراتب الٰھیہ			مراتب کونیہ			مرتبہ جامعہ
پہلا مرتبہ	دوسرا مرتبہ	تیسرا مرتبہ	چوتھا مرتبہ	پانچواں مرتبہ	چھٹا مرتبہ	ساتواں مرتبہ
ذاتِ الٰہی	پہلا تنزل	دوسرا تنزل	تیسرا تنزل	چوتھا تنزل	پانچواں تنزل	چھٹا تنزل
احدیت	وحدت	وحدیت	روح	مثال	جسم	انسان
غیب مطلق	حقیقتِ محمدیہ	اعیانِ ثابتہ				

ابن عربی کے اس فلسفہ کو اب ایک سادہ سی مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں' مثلاً جب کوئی بڑھئی کسی میز کو بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ذہن میں پہلے میز کا ایک اجمالی تصور آتا ہے اور اس کے بعد اب اس میز کا تفصیلی تصور آتا ہے۔ یعنی پہلے اس کے ذہن' خیال یا تصور میں یہ بات آئے گی کہ اس نے میز بنانی ہے۔ اس کے بعد اگلے مرحلہ میں اس کے ذہن' تصور یا خیال میں یہ بات آئے گی کہ اس نے کیسی میز بنانی ہے۔ یعنی اس میز کے دراز ہوں گے یا نہیں؟ اس میز میں نیچے پاؤں رکھنے کی جگہ ہوگی یا نہیں؟ اس میز کی لمبائی' چوڑائی کتنی ہوگی؟ وغیرہ ذلک۔ شیخ ابن عربی یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو بنانے کا ارادہ کیا تو اس کا ایک اجمالی تصور کیا اور یہ اجمالی تصور ان کے ہاں 'حقیقتِ محمدیہ' کہلایا۔ اس مرتبے کی تائید میں وہ "اَوَّلُ ما خلقَ

اللّٰہُ نُوْرِی'' جیسی باتفاق المحدثین ضعیف روایت سے استدلال کرتے ہیں۔'حقیقتِ محمدیہ' کو صوفیاء کے ہاں 'مرتبۂ وحدت' اور 'موجود اجمالی' اور 'حقیقۃ الحقائق' اور 'عقل اوّل' اور 'عالمِ صفات' اور 'ظہورِ اوّل' اور 'عالمِ رموز' اور 'اُمّ الفیض' وغیرہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ہم نے ان اصطلاحات کا تذکرہ اس لیے کر دیا ہے کہ جو شخص ابن عربی کے اس مرتبہ اور تنزل کو گہرائی میں سمجھنا چاہتا ہو تو وہ ان اصطلاحات میں سرسری غور و فکر کے ذریعے بھی اس مرتبہ کے متفرق و متنوع پہلوؤں اور جہات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

ابن عربی کے نزدیک اس اجمالی تصور اور خیال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کرنے والی مخلوق کا تفصیلی تصور اور خیال کیا اور اس مقام کا نام شیخ ابن عربی کے ہاں 'اَعیانِ ثابتہ' ہے۔اس مرتبے کو صوفیاء کے ہاں 'مرتبۂ واحدیت' اور 'قابلیتِ ظہور' اور 'وجودِ فائض' اور 'ظلِّ ممدود' وغیرہ جیسی اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے' جو اس مرتبے کی مختلف جہات کو واضح کر رہی ہیں۔'اَعیانِ ثابتہ' سے شیخ ابن عربی کی کیا مراد ہے؟ اسے ہم آسان الفاظ میں ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ خارج میں موجود مخلوقات کے جو ہیولے اللہ کے خیال اور تصور [یعنی صفت علم] میں موجود ہیں' وہ اَعیانِ ثابتہ ہیں۔یعنی ہر ہر پیدا شدہ مخلوق کا ایک عینِ ثابت اللہ کے علم میں موجود ہے اور اس عینِ ثابت کے مطابق اس مخلوق کا ظہور ہوتا ہے' جیسا کہ ایک بڑھئی جب میز' کرسی اور پلنگ وغیرہ بناتا ہے تو ان کو بنانے سے پہلے اس کے ذہن میں ان کے ہیولے موجود ہوتے ہیں اور جیسا ہیولہ اس کے ذہن میں ہوگا ویسی ہی کرسی' میز یا پلنگ وہ خارج میں بنائے گا۔ان تین مراتب یعنی ذاتِ الٰہی' حقیقتِ محمدیہ [پیدا ہونے والی مخلوق کا اللہ کے علم میں اجمالی تصور] اور اَعیانِ ثابتہ [پیدا ہونے والی مخلوق کا اللہ کے علم میں تفصیلی تصور] کو شیخ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود میں 'مراتبِ الٰہیہ' کہتے ہیں' کیونکہ تنزلِ اوّل و ثانی کی صورت میں اللہ کا اِجمالی علم ہو یا تفصیلی علم' وہ اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفات عینِ ذات ہیں' پس یہ تینوں اللہ کی ذات ہی کے مراتب ہیں۔شیخ ابن عربی کا فلسفۂ وحدت الوجود کا مرکزی خیال یہاں ہی ختم ہو جاتا ہے۔اَعیانِ ثابتہ کے بارے میں شیخ ابن عربی کا یہ نقطۂ نظر نہایت اہم ہے کہ ''الأعیان ما شمت رائحۃ الوجود الخارجی'' یعنی اعیانِ ثابتہ نے خارج میں وجود کی بو بھی نہیں چکھی۔یعنی اللہ کے علم میں' اعیان ثابتہ کے مطابق' خارج میں کوئی مخلوق وجود میں نہیں آئی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اعیانِ ثابتہ [یعنی اللہ کے علم میں پیدا ہونے والی اشیاء کے ہیولوں] کے مطابق خارج میں کوئی شے وجود میں نہیں آئی تو بقیہ چار تنزلات کا کیا معنی و مفہوم ہے؟ تیسرے' چوتھے' پانچویں اور چھٹے تنزل کے بارے میں شیخ ابن عربی کا کہنا یہ ہے کہ یہ درحقیقت اَعیانِ ثابتہ کا عکس اور سایہ ہیں۔یعنی چوتھے سے چھٹے تنزل تک تنزل اعیانِ ثابتہ کے عکوس و ظلال میں ہوا ہے' لیکن یہ عکوس و ظلال شیخ کے نزدیک اعیانِ ثابتہ کا عین بھی ہیں۔اس کو سادہ سی مثال سے یوں سمجھیں کہ جب ہم آئینہ سورج کے سامنے رکھیں تو ہمیں آئینے میں سورج کا عکس نظر آتا ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ آئینے میں موجود سورج کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے بلکہ وہ محض آسمان والے سورج کا عکس ہے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ آئینے میں جو ہمیں سورج نظر آ رہا ہے وہ وہی سورج ہے جو آسمان میں ہے' کیونکہ اسی آسمان والے سورج کی شعاع نے آئینے سے ٹکرا کر اس کا عکس پیدا کیا ہے' لہٰذا

آئینے والے سورج کو آسمان والے سورج سے تعبیر کرنا صحیح ہے اور اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آئینے میں جو سورج نظر آ رہا ہے' یہ وہی آسمان والا سورج ہے تو اس کا یہ کہنا درست ہوگا۔ پس اگر آئینے کے سامنے کوئی انسان کھڑا ہے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ آئینے میں عکس کسی جانور کا نظر آئے' پس کسی شے کا عکس اس کے حقیقی وجود کے عین مطابق ہوتا ہے۔ لیکن شیخ ابن عربی اس عکس کو عین مطابق نہیں بلکہ عین کہتے ہیں' جیسا کہ انہوں نے صفات کو ذات کا عین قرار دیا ہے۔ ایک اور بات یہ بھی واضح رہے کہ شیخ وحدت الوجود کے قائلین صوفیاء کے ہاں صورتِ شے' عینِ شے ہوتی ہے۔ پس شیخ ابن عربی کے نزدیک خارجی وجود' اعیانِ ثابتہ کے عکوس وظلال ہیں اور درحقیقت اعیانِ ثابتہ یعنی اللہ کے علم یا تصور یا خیال سے باہر کسی شے کا خارجی وجود نہیں ہے۔ اگر خارجی وجود ہے تو وہ اعیانِ ثابتہ کے عکوس وظلال کا ہے اور انہی عکوس وظلال میں وہ تنزلات کے چار مراحل بیان کرتے ہیں۔

شیخ ابن عربی کے اس نظریہ' وحدت الوجود کو مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب 'الدین القیم' میں نہایت ہی سادہ سی مثال سے بیان کر دیا ہے' جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر آپ مینارِ پاکستان کا تصور کریں تو یہ مینارِ پاکستان آپ کے تصور اور خیال میں قائم ہے' جیسے ہی آپ اپنا تصوّر اور خیال ہٹائیں گے تو یہ مینارِ پاکستان بھی ختم ہو جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بھی اس کائنات کا تصوّر اور خیال کیا ہے اور یہ کائنات اللہ کے تصور اور خیال میں قائم ہے اور خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پس جس طرح میں مینارِ پاکستان کا تصور کرتا ہوں اور میرا تصور یا خیال یا فکر میرے وجود سے باہر نہیں ہوتا' اسی طرح اللہ نے جو اس کائنات کا اعیانِ ثابتہ کی صورت میں تصور کیا ہے تو وہ اللہ کے وجود سے باہر نہیں ہے۔ پس اس طرح وحدت الوجود ثابت ہو گیا اور ہمیں جو خارج میں نظر آ رہا ہے وہ اللہ کے تصور اور خیال کا عکس ہے اور عکس کوئی حقیقی وجود نہیں ہوتا یا عکس اپنے وجود کا عین ہوتا ہے۔

شیخ ابن عربی کے بیان کردہ تیسرے' چوتھے اور پانچویں تنزل کو 'مراتبِ کونیہ' کا نام دیا جاتا ہے اور انہیں 'مراتبِ امکانیہ' بھی کہتے ہیں' یعنی ان مراتب کی اشیاء کے وجود کا اگرچہ خارج میں امکان ہے لیکن خارج میں ان اشیاء کا وجود نہیں ہے۔ پس ابن عربی کے نقطہ نظر کے مطابق یہ کائنات اور اس میں موجود ہر شے درحقیقت اللہ کا خیال اور تصور ہے اور اس کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے۔ پس خارج میں سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے کوئی اور وجود نہیں ہے اور اسی کو صوفیاء وحدتُ الوجود کہتے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا موقف

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وحدت الوجود سے مراد ہمہ اوست یا حلول ہرگز نہیں ہے۔ ہمہ اوست یا حلول کے نظریات کو وہ کفر وشرک گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی اور قائم بالذّات وجود صرف وجودِ باری تعالیٰ ہے' باقی تمام وجود حادث اور ممکن ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ تو سب جانتے ہیں کہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ 'واجب الوجود' اور 'قدیم' ہے—— جبکہ کُل کون ومکاں اور انسان سمیت جملہ مخلوقات وموجودات 'ممکن' اور 'حادث' ہیں۔''

(ایجاد وابداع عالم سے عالمی نظام خلافت تک: ص ۵)

نیز وہ لکھتے ہیں:

''ہمہ اوست کی ایک تعبیر pantheism ہے۔یعنی جب وجود ایک ہی ہے تو یہ کائنات گویا خدا کا حصہ ہے یا ہمہ تن خدا ہے' خود خالق ہی نے مخلوق کی شکل اختیار کر لی' جیسے برف پگھل کر پانی بن گئی اور پانی کو آپ نے اُبالا تو وہ بھاپ بن گیا--- اب پانی ہی برف بھی ہے اور بھاپ بھی ہے--- اس نظریے میں کائنات کو حقیقی مانا گیا ہے کہ یہ درحقیقت واقعی ہے اور یہ خالق کا حصہ ہے یا خالق ہی ہے--- اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ عظیم ترین کفر وشرک ہے اور اس کا اسلام کے ساتھ یا حقیقت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے''۔(اُمّ المسیحات:ص۸۶'۸۷)۔

تاہم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے ہاں جب قدیم اور حادث کے باہمی ربط کا سوال پیدا ہوا تو انہوں نے اس مسئلے کا جو حل پیش فرمایا تو اس کی اصل بنیاد عقیدہ کی بجائے فلسفہ وعلم سائنس ہے۔اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ربط الحادث بالقدیم کے ذیل میں وحدت الوجود کا جو نکتہ نظر ڈاکٹر صاحب پیش کرتے ہیں وہ ان سے پہلے اس صورت میں کسی نے پیش نہیں کیا۔اس نظریے کی متفرق کڑیاں یا منتشر تصورات تو انہوں نے مختلف علوم اور اشخاص سے حاصل کیے ہیں لیکن ان کڑیوں کو ایک ترتیب اور منظم فکر میں پرونا ان کا ذاتی اور تخلیقی کام ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس عمیق مسئلے کو کیوں چھیڑا ہے' اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''اس سلسلہ میں آخری بات یہ عرض کر رہا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے حضرات کا شاید یہ ذوق نہ ہو' اس کے باوجود میں یہ مسئلہ اس لیے بیان کر دیا کرتا ہوں کہ ان بزرگوں اور اسلاف کے بارے میں سوئے ظن نہ رہے جو وحدت الوجود کے قائل ہیں۔اس سے ہمیں اپنے آپ کو بچا لینا چاہیے' کیونکہ یہ بہت بڑی محرومی ہے۔کسی بھی شخص سے اختلاف کا حق ہر شخص کو حاصل ہے....''(اُمّ المسیحات:ص۹۴)

بنا بریں وہ شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ احمد سرہندی رحمہما اللہ وغیرہ کے توشخصی دفاع کے قائل ہیں اور ان حضرات پر مشرک' کافر یا ضال کا فتویٰ لگانے کے خلاف ہیں' لیکن شیخ ابن عربی پر کوئی فتویٰ لگائے جانے کے بارے میں وہ ایسے حساس نظر نہیں آتے۔ایک جگہ فرماتے ہیں:

''اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ کسی کو ابن عربی سے سوءظن ہو' کوئی انہیں مرتد سمجھے یا جو چاہے کہے اس سے کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا۔لیکن شاہ ولی اللہ ﷺ کو اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ مشرک تھے یا مرتد تھے یا ضال اور مضل تھے تو یہ بات بڑی تشویش کی ہے''۔(اُمّ المسیحات:ص۴۸)

نیز یہ بھی واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب کو شیخ ابن عربی سے صرف ایک ہی بات میں اتفاق ہے۔اس کے علاوہ وہ شیخ ابن عربی کی طرف منسوب جملہ خرافات' شرکیہ کلمات اور بدعات سے اعلان براءت کرتے ہیں۔

اب ہم آتے اصل مسئلے کی طرف۔شیخ ابن عربی کے ہاں تنزلات کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی صفت علم میں ہوا ہے اور چونکہ صفت علم ذات سے علیحدہ کوئی شے نہیں ہے لہٰذا تنزل درحقیقت ذات میں ہی تمایزِ علمی کی صورت میں ہوا ہے' جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہاں تنزلات کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام میں ہوا ہے۔ڈاکٹر اسرار صاحب کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو کلمہ 'کُن' کہا' جیسا کہ قرآن میں کئی ایک مقامات پر یہ بات مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو 'کُن فَیکون' کے ذریعے پیدا کیا ہے۔اب

اہلِ سنّت کا عام تصور تو یہ ہے کہ کلمۂ 'کُن' مخلوقات کے وجود کا سبب بنا ہے یعنی اللہ نے کلمۂ 'کُن' کہا اور جس مخلوق کو اللہ نے پیدا کرنا چاہا وہ اس کلمۂ 'کُن' کے سبب سے پیدا ہوگئی۔ جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یہاں قدیم اور حادث کے ربط کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ

(۱) جب اللہ تعالیٰ نے پہلی مرتبہ مخلوق پیدا کرنی چاہی تو کلمۂ 'کُن' سے مخلوق پیدا نہیں ہوئی بلکہ کلمۂ 'کُن' نے ہی اس مخلوق کی صورت اختیار کر لی جس کو اللہ نے پیدا کرنا چاہا تھا۔ گویا اللہ کی ایک صفت یعنی صفت کلام نے اوّلین مخلوق کی صورت اختیار کر لی اور یہ اوّلین مخلوق ایک نورِ بسیط تھا جس نورِ بسیط سے بعد ازاں ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ پیدا ہوئے ہیں۔ یہ تنزل کا پہلا مرحلہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''تخلیقِ کائنات کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے اوّلین کلمۂ 'کُن' نے اپنے تنزلِ اوّل کے مرحلہ اوّل میں ایک نورِ بسیط کی صورت اختیار کی--- اور اس سے اللہ تعالیٰ نے خلعتِ وجود عطا فرمایا ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ کو' جن کی اصل 'نور' ہے''۔ (ایجاد و ابداع عالم سے عالمی نظام خلافت تک: ص ۱۷)

ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ کی پیدائش جس عالم میں ہوئی ہے' اسے ڈاکٹر صاحب 'عالم امر' یا 'عالم نور' کا نام دیتے ہیں اور اسے زمان و مکان سے ماوراء قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اس عالم میں پیدائش کی نسبت ہی سے یہ دونوں مخلوقات زمان و مکان کی محدودیت سے ماوراء ہیں۔

تنزل کے دوسرے مرحلہ میں ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور کلمۂ 'کُن' کہا جس سے اس نورِ بسیط کا ایک حصہ نار یعنی آگ میں تبدیل ہو گیا جسے ہم آگ کا ایک بہت بڑا گولہ کہہ سکتے ہیں۔ اور اس بڑے آتشی گولے کی پیدائش کو ڈاکٹر صاحب زمان و مکان کی پیدائش کا نقطہ آغاز قرار دیتے ہیں۔ ان کے موقف کے مطابق اس آتشیں گولے سے جنات پیدا کیے گئے۔ فزکس کے ماہرین اسے Big Bang کا نام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دوسرے تنزل میں پیدا شدہ مخلوق کے عالم کو 'عالمِ خلق' کا نام دیتے ہیں اور اس عالم کی اشیاء میں ان کے ہاں زمان و مکان کی محدودیت کا تصور موجود ہے۔ ڈاکٹر اسرار رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''سلسلہ تنزلات کا مرحلہ ثانی عالمِ امر سے عالمِ خلق کی جانب تنزل کی پہلی منزل ہے اور یہ وہ مرحلہ ہے جس تک ایک مُبہم اور مُجمل رسائی جدید علم طبیعیات کو بھی حاصل ہو چکی ہے..... یہ دھماکہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کے ایک دوسرے امر 'کُن' کے نتیجے میں نورِ بسیط کے ایک حصے میں ہوا جس کے نتیجے میں اس 'نور' نے عہدِ حاضر کے عظیم ماہر طبیعیات سٹیون وائن برگ کے قول کے مطابق ایک ایسی 'نار' کی شکل اختیار کر لی جو ایسے نہایت چھوٹے ذرّات (electrons, positrons & neutrinos) پر مشتمل تھی جن کا درجہ حرارت ناقابلِ تصوّر حد تک بلند تھا اور جو ناقابل تصور سرعت رفتار کے ساتھ ایک دوسرے سے دور بھاگ رہے تھے..... الغرض! یہ تھا عالم مادّی کا نقطہ آغاز اور مراتب نزول کا مرحلہ ثانی..... بہرحال اس ناری مرحلے پر جو صاحبِ تشخّص اور صاحبِ شعور و ارادہ مخلوق پیدا کی گئی وہ 'جنات' تھے جن کا مادۂ تخلیق قرآن کی جا بجا صراحت کی بنا پر آگ ہے''۔ (ایضاً: ص ۲۰۔۲۲)

تنزلات کے تیسرے مرحلہ میں ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے ہاں اس آتشیں گولے سے علیحدہ ہونے والے آتشیں کرے ٹھنڈے پڑ گئے اور ان کروں میں سے ایک ہماری زمین بھی ہے۔ جب اس زمین کے کرے کی

گرمی اوپر کو نکلی تو اس گرمی نے بخارات کی صورت اختیار کرتے ہوئے بادلوں کی صورت اختیار کر لی اور موسلا دھار بارشیں شروع ہوگئیں۔ ان بارشوں کے پانی اور زمین کی مٹی کے امتزاج سے حکمِ الٰہی کے سبب' زمین پر حیات کا آغاز ہوا۔ جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے حیوانِ آدم اور حیوانِ آدم میں روح کے پھونکے جانے سے پہلا انسان پیدا ہوا۔ (ایضاً: ص ۲۲۔۲۳)

ایک جگہ ڈاکٹر صاحب اس ارتقاء کے مراحل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''.....اور پھر ساحلی علاقوں میں حیاتِ ارضی کے 'مادۂ تخلیق' یعنی مٹی یا تُراب' اور اس کے 'منبع حیات' یعنی پانی کے تعامل سے 'ارتقاء' کا وہ مرحلہ وار عمل شروع ہوا' جس کی انتہا حضرت آدمؑ نہیں بلکہ صرف حیوانِ آدم (Homo Sapiens) کا ظہور تھا۔'' (ایضاً: ص ۲۴)

یہ واضح رہے کہ 'بگ بینگ' سے انسان کی تخلیق تک کے تنزلات اور ارتقاء کے جمیع مراحل ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے نزدیک امرِ الٰہی اور کلمۂ 'کُن' کا نتیجہ ہیں جبکہ اہل سائنس کے ہاں یہ تنزلات اور ارتقاء ایک میکانکی اور طبعی عمل ہے جس کے پیچھے کوئی محرک یا خالق موجود نہیں ہے۔

دونوں موقف میں جوہری فرق

شیخ ابن عربی اور ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے موقف میں درج ذیل جوہری فرق پائے جاتے ہیں:

پہلا فرق: شیخ ابن عربی کے نزدیک تنزلِ اوّل اور ثانی اللہ کی صفتِ علم میں ہوا ہے اور صفتِ علم میں بھی ان دو تنزلات کا معنی صفتِ علم میں فقط اجمالی اور تفصیلی تمایز کا پیدا ہونا ہے' اور شیخ کے ہاں صفات کے عین ذات ہونے کی وجہ سے یہ ذات ہی کا تنزل ہے' جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے ہاں تنزل صفتِ کلام میں ہوا ہے۔

دوسرا فرق: شیخ ابن عربی کے نزدیک اعیانِ ثابتہ نے چونکہ وجود کی بو بھی محسوس نہیں کی ہے لہٰذا اس کائنات کا وجود اصلاً معدوم ہے' یعنی خارج میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ ایک جگہ شیخ ابن عربی لکھتے ہیں:

"لا يراه إلا هو' ولايدركه إلا هو' ولا يعلمه إلا هو' يرى نفسه بنفسه' ويعرف نفسه بنفسه' لا يراه أحد غيره' ولايدركه أحد غيره' حجابه وحدانيته لا يحجبه شيء غيره' لا نبي مرسل ولا ولي كامل ولا ملك مقرب يعرفه' نبيه هو ورسوله هو' ورسالته هو وكلامه هو' أرسل نفسه بنفسه إلى نفسه ولا واسطة ولا سبب غيره' ولا تفاوت بين المرسِل والمرسَل' والمرسَل به والمرسَل إليه' ووجود حرف اللّٰه وجوده' لا غيره ولا فناه' ولا اسمه ولا مسماه' ولا وجوده بغيره فلهذا قال النبي صلى اللّٰه عليه وسلّم: من عرف نفسه فقد عرف ربه۔ وقال عليه الصلاة والسلام: عرفت ربي بربي۔ أشار عليه السلام بذلك أنت لست أنت أنت' بل أنت هو بلا أنت' لا هو داخل فيك' ولا أنت داخل فيه' ولا هو خارج عنك' ولاأنت خارج عنه' ما أعني بذلك: أنك موجود وصفتك هكذا بلا غير له' بل أعني به: أنك ما كنت

قط ولا تكون' لا بنفسك ولا به' ولا فيه ولا معه ولا عنه ولا منه ولا له' ولا أنت فان ولا موجود' أنت هو وهو أنت." (كتاب الهُوَ : ص ٣۔٤)

''اسے [یعنی اللہ] کوکوئی نہیں دیکھتا مگر وہ خود' اور اس کا ادراک کوئی نہیں کرتا مگر وہ خود' اللہ تعالیٰ اپنے نفس کو اپنے نفس کے ساتھ دیکھتا ہے' اور اپنے نفس کی معرفت اپنے نفس کے ساتھ حاصل کرتا ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی بھی اسے دیکھ نہیں سکتا ہے اور نہ ہی اس کا ادراک کر سکتا ہے' اس کا حجاب اس کی وحدانیت ہے اور اللہ کے علاوہ اس کا حجاب بھی وہی ہے۔ کوئی بھی نبی مرسل' ولی کامل اور مقرب فرشتہ اس کی معرفت نہیں رکھتا ہے۔ اس کا نبی بھی وہی ہے اور اس کا رسول بھی وہی ہے' اس کی رسالت بھی وہی ہے اور اس کا کلام بھی وہی ہے۔ اللہ نے اپنے نفس کو اپنے نفس کے ساتھ اپنے ہی نفس کی طرف رسول بنا کر بھیجا اور اس کے علاوہ کوئی واسطہ یا سبب موجود نہیں ہے۔ بھیجنے والے اور جس کی طرف بھیجا گیا ہے' ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور جس کے ساتھ بھیجا گیا ہے اور جس کی طرف بھیجا گیا ہے' ان میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ لفظ اللہ کے حروف کا وجود بھی اسی کا وجود ہے۔ اس کے علاوہ کا نہ تو وجود ہے اور نہ ہی اس کے لیے فنا ہے [کیونکہ کسی کا وجود ہوگا تو وہ فنا ہوگی] اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی اسم کا وجود ہے اور نہ ہی مسمّٰی کا' اس کے غیر کا وجود نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا' اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ [واضح رہے کہ یہ روایت باتفاق المحدثین موضوع ہے]۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے کہ میں نے اپنے رب کو اپنے رب کے ذریعے پہچانا۔ [یہ روایت بھی موضوع ہے]۔ اس قول کے ذریعے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بے شک تو' تو نہیں ہے بلکہ تو' وہ [یعنی اللہ] ہے بغیر اس کے کہ تو ہے۔ نہ وہ تجھ میں داخل ہے اور نہ تو اس میں داخل ہے اور نہ وہ تجھ سے خارج ہے اور نہ تو اس سے خارج ہے۔ میری اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ تو موجود ہے اور تیری یہ صفت اس طرح ہے کہ کہ تیرا کوئی غیر نہیں ہے بلکہ میری اس سے مراد یہ ہے کہ تو کبھی بھی نہ تھا اور نہ ہی تو ہوگا' نہ تو اپنے نفس کے ساتھ موجود ہے اور نہ ہی اس [یعنی اللہ] کے ساتھ' اور نہ تو اس میں ہے اور نہ اس کے ساتھ اور نہ اس سے اور نہ اس کی وجہ سے اور نہ اس کے لیے ہے۔ تو نہ تو فانی ہے اور نہ ہی موجود ہے۔ تو وہ [یعنی اللہ] ہے اور وہ [یعنی اللہ] تو ہے۔''

یہ واضح رہے کہ شیخ ابن عربی کا مسلک حلول کا نہیں ہے' کیونکہ حلول کے لیے ضروری ہے کہ کوئی اور شئے ہو کہ جس میں اللہ کی ذات حلول کر سکے۔ یعنی محل کا ہونا ضروری ہے اور اگر محل مان لیا جائے تو ایک سے زائد وجود ثابت ہو جائیں گے۔ جبکہ شیخ ابن عربی کا مذہب اللہ کے علاوہ ہر شے کے وجود کا انکار ہے۔ البتہ شیخ ابن عربی کا مذہب اتحاد کا کہا جا سکتا ہے' کیونکہ ان کے نزدیک انسان' حیوانات' ملائکہ' جنّات' انبیاء و رسل اور جمیع کائنات و مخلوق درحقیقت اعیانِ ثابتہ ہیں' یعنی اللہ کے علم میں ہیولوں کی شکل میں موجود ہیں اور انہوں نے وجود کی بو تک نہیں چکھی ہے' لہٰذا یہ سب کائنات اللہ کا خیال اور تصور ہے اور اللہ کا خیال اور تصور اس کی ذات سے باہر نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی شیخ ابن عربی کے مذہب کو حلول کی بجائے اتحاد کا مذہب قرار دیا ہے اور اس بارے تفصیلی بحث کی ہے۔

اس کے برعکس ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ اس کائنات کے وجود کا انکار نہیں کرتے اور اسے ایک حقیقت قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''.....یعنی کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ محض وہم یا خیال ہے' یہ یا تو محض آئینوں میں نظر آنے والے عکس ہیں یا سائے ہیں۔ حقیقت میں تو صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا وجود ہے اور کوئی شے حقیقتاً موجود نہیں ہے۔ ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے! لیکن یہ بات کہ کائنات کا وجود ہے ہی نہیں' قابلِ قبول نظر نہیں آتی۔ یہ ایک شاعرانہ خیال یا فلسفیانہ توجیہہ تو ہو سکتی ہے' لیکن کائنات تو بڑی ٹھوس حقیقت ہے۔ آپ نے شرک فی الوجود کی نفی کرنے کے لیے کائنات ہی کی نفی کر دی؟'' (اُمّ المسبّحات: ص ۸۷)

پس ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ماسوا کا بھی وجود ہے' لیکن ان کے نزدیک اللہ کے ماسوا یا کائنات کے وجود کا اصل منبع بھی اللہ کی ذات ہی ہے' یعنی اللہ کے کلمہ 'کُن' نے ہی تنزلات کی صورت میں چونکہ اس کائنات کی صورت اختیار کر لی ہے لہٰذا اس کائنات کی اصل کو دیکھیں تو وحدتُ الوجود ہے۔ یعنی یہ کائنات بھی اپنے آغاز اور مبدأ میں اللہ کا ایک کلمہ کُن یا صفت کلام ہے اور اللہ کی صفات اللہ کا غیر نہیں ہیں۔ البتہ اگر اس کائنات کا حال دیکھیں تو یہ اللہ کی ذات سے ایک علیحدہ وجود ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اب سمجھئے کلمہ 'کُن' کیا ہے؟ کلام ہے' کلمہ ہے۔ اور کلام متکلّم کی صفت ہوتا ہے۔ گویا کہ حرف 'کن' اللہ کی صفت ہے اور صفت کے بارے میں متکلمین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ 'لا عین ولا غیر'۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ کائنات نہ اللہ کا عین ہے اور نہ غیر ہے... [یعنی] 'من وجہ عین ومن وجہ آخر غیر' ایک اعتبار سے یہ عین ہیں اور ایک اعتبار سے غیر ہیں۔ ماہیت وجود میں اتحاد ہے اور جہاں بھی تعین ہوگا اور مختلف چیزوں کا وجود مان لیا جائے گا تو وہ اللہ کا غیر ہے۔'' (اُمّ المسبّحات: ص ۹۴)

پس ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کی بنیاد خالق ومخلوق کا 'اتحاد' ہے' مخلوق کو محض اعیانِ ثابتہ قرار دیتے ہوئے انہوں نے خالق ومخلوق کو متحد کر دیا جبکہ ڈاکٹر صاحب کے نکتہ نظر میں ثنویت لازم آتی ہے اور خالق ومخلوق کا اتحاد ثابت نہیں ہوتا' کیونکہ وہ کائنات کو ذاتِ باری تعالیٰ سے جدا ایک ٹھوس حقیقت قرار دیتے ہیں۔

تیسرا فرق: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے نزدیک حقیقت و ماہیتِ وجود کے ذیل میں اصل بحث ربط الحادث بالقدیم کی ہے' یعنی وہ اس ربط کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ حادث کا ہے جس کی حقیقت جاننے کے وہ خواہاں ہیں جبکہ قدیم یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کی حقیقت یا کنہ کو جاننا ان کے نزدیک ممکن نہیں ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''اللہ کی معرفت کے ضمن میں اب ایک بات اور نوٹ کیجیے۔ معرفت رب کو دو حصّوں میں تقسیم کیجیے' ایک معرفت ذات اور ایک معرفت صفات۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا کوئی تصور کسی انسان کے لیے قطعاً ممکن نہیں۔ یہ ہمارے لیے out of bounds ہے۔ اس پر سے پردہ آخرت میں اٹھے گا۔ چنانچہ آخری نعمت جو اہلِ جنّت کو نصیب ہوگی وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا..... حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ قول منسوب ہے: 'العجز عن درك الذات إدراك' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہو جانے کا جب انسان کو احساس ہو جائے تو یہی ادراک ہے۔ یعنی معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد! یہی درحقیقت علم ہے کہ

ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کی ذات کا کوئی تصوّر' کوئی تخیل اور کوئی فہم ہمارے لیے ممکن نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا قول پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: 'والبحث عن کنه الذات إشراك' یعنی اللہ کی ذات میں اگر کھوج کرید کرو گے تو کہیں نہ کہیں شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔''

(اُمّ المسبّحات: ص۳۲۔۳۳)

یعنی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نزدیک ان کے نظریہ وحدت الوجود کا بنیادی سبب حادث کی معرفت حاصل کرنا ہے' جبکہ اس کے برعکس ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود میں اصل بحث حادث کے ذریعے قدیم کی معرفت حاصل کرنا ہے' کیونکہ حادث کا وجود تو اس نقطہ نظر میں ہے ہی نہیں۔ مثلاً شیخ ابن عربی کی کتاب 'الھُوَ' کا بنیادی موضوع 'معرفت قدیم بذریعہ حادث' ہی ہے' کیونکہ مطلق 'ھُو' سے مراد کسی صورت بھی صوفیاء کے ہاں حادث نہیں ہوتا۔ البتہ قدیم کی معرفت میں بعض سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینے کے لیے شیخ نے ربط الحادث بالقدیم کو تنزلاتِ ستہ کی صورت میں واضح کیا ہے۔

چوتھا فرق: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ وحدت الوجود کے ثبوت میں ابن عربی کے تنزلاتِ ستہ کے نکتہ نظر کو ماننے سے انکاری ہیں' کیونکہ ان کے خیال میں ان تنزلات کی کوئی شرعی و عقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اسی طرح بعض متصوف المزاج بزرگوں نے مرتبہ احدیت و واحدیت وغیرہ کے حوالے سے تنزلاتِ ستہ تجویز کیے' لیکن ان کے لیے بھی کوئی صریح اساس نہ عقل میں ہے نہ نقل میں!''

(ایجاد و ابداعِ عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک: ص۵)

یہ بھی واضح رہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ جن تنزلاتِ ستہ کا یہاں رد کر رہے ہیں وہی درحقیقت شیخ ابن عربی کا موقف ہے' لیکن ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ تنزلاتِ ستہ کا موقف اصلاً ابن عربی کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے 'اُمّ المسبّحات' میں جس موقف کی نسبت شیخ ابن عربی کی طرف کی ہے وہ غالباً بعض حکماء کا ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے غلطی سے ابن عربی کا سمجھ لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے شیخ ابن عربی کے موقف کا مطالعہ براہ راست ان کی کتب سے نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے شیخ کا موقف ثانوی ذرائع سے معلوم کیا تھا جس وجہ سے انہیں شیخ کا موقف سمجھنے اور بیان کرنے میں غلطی لگی۔

گویا کہ صورت حال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب 'ایجاد و ابداعِ عالم' میں وحدتُ الوجود کی جس تعبیر کو خلافِ عقل و نقل قرار دے رہے ہیں وہی درحقیقت شیخ ابن عربی کی تعبیر ہے اور 'اُمّ المسبّحات' میں شیخ ابن عربی کی طرف جو موقف منسوب کر رہے ہیں وہ شیخ ابن عربی کا نہیں ہے بلکہ بعض دوسرے ایسے حکماء کا ہے جو یونانی فلسفہ کے زیر اثر ہیں۔ 'اُمّ المسبّحات' میں ڈاکٹر صاحب ابن عربی کے نظریہ وحدتُ الوجود کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''ابن عربی کا نظریہ یہ ہے کہ خالق اور کائنات کا وجود تو ایک ہی ہے' ماہیت کے اعتبار سے کائنات عینِ وجودِ باری ہے' لیکن جہاں تعین ہو جاتا ہے وہاں وہ غیر ہو جاتا ہے''۔ (اُمّ المسبّحات: ص۵۴)

جس نکتہ نظر کی یہاں ڈاکٹر صاحب ابن عربی کی طرف نسبت کر رہے ہیں' وہ درحقیقت بعض حکماء کا ہے' جیسا کہ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے اپنی کتاب 'عبقات' میں تنزلات اور مطلق ومقید وجود کے اتحاد واختلاف کے نکتہ ہائے نظر کو دو نظریات شمار کیا ہے۔ مطلق ومقید وجود کے اتحاد واختلاف کا نظریہ یہ ہے کہ مطلق وجود ایک ہے لیکن مقید وجود ایک سے زائد ہیں' مثلاً کرسی' عینک اور کتاب تینوں کا مادہ ایک ہی ہے۔ سائنس کے مطابق یہ تینوں اشیاء چھوٹے چھوٹے ایٹموں سے مل کر بنی ہیں' یعنی ان تینوں اشیاء کی حقیقت ایک ہے اور وہ حقیقت ایٹم ہے جبکہ اپنی ہیئت اور ترکیب کے اعتبار سے یہ اشیاء جدا جدا ہیں۔ پس اصل کو دیکھیں تو کرسی' عینک اور کتاب ایک ہی شے ہیں اور موجودہ ہیئت اور ترکیب کا مشاہدہ کریں تو یہ جدا جدا ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے 'بوادر النوادر' میں یہی لکھا ہے کہ ابن عربی کے نقطہ نظر کے مطابق اس کائنات کو عینِ حق کہنا بھی صحیح ہے اور معدوم کہنا بھی صحیح ہے اور دونوں قسم کی عبارتیں اس موقف کے حاملین کے ہاں ملتی ہیں۔ بعض لوگوں نے ابن عربی کی کتابوں 'فصوص الحکم' اور 'فتوحاتِ مکیہ' کو جو باہم متضاد سمجھ لیا اور 'فتوحاتِ مکیہ' کو ابن عربی کا آخری نظریہ قرار دیا' راقم کے خیال میں وہ غلطی پر ہیں۔ شیخ کی دونوں کتابوں میں کوئی تضاد نہیں ہے' درحقیقت یہ دونوں کتابیں ایک ہی نظریہ کی متنوع جہات ہیں' اور دوسری بات یہ ہے کہ 'فصوص الحکم' کی عبارات 'فتوحات مکیہ' میں بھی موجود ہیں' اگر کسی نے 'فتوحاتِ مکیہ' کا تفصیلی مطالعہ کیا ہو تو وہ یہ بات جان لے گا۔

مولانا اشرف تھانویؒ فرماتے ہیں کہ شیخ ابن عربی اور ان کے موقف کے حاملین جو بعض اوقات کائنات کو عین حق کہتے ہیں اور بعض اوقات معدوم کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس کی مثال سورج اور آئینے کی ہے۔ ایک آئینے کو اگر سورج کے سامنے رکھا جائے تو آئینے میں جو سورج نظر آتا ہے تو وہ اس سورج سے کوئی علیحدہ سورج نہیں ہے جو آسمان میں ہے۔ پس یہ کائنات اس اعتبار سے اللہ کا عین ہے کہ یہ اس سے علیحدہ کوئی اور وجود نہیں ہے۔ اور اگر ہم آئینے میں نظر آنے والے سورج پر غور کریں تو ایک اعتبار سے وہ معدوم بھی ہے کیونکہ اس کا اپنا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے' اگر آپ آئینہ سورج کے سامنے سے اٹھالیں تو آئینے میں سورج کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔

<u>پانچواں فرق</u>: شیخ ابن عربی کے نزدیک اعیانِ ثابتہ حقیقتِ محمدیہ کا عین' اور حقیقتِ محمدیہ ذات باری تعالیٰ کا عین ہے' کیونکہ شیخ کے ہاں صفاتِ ذاتِ حق' عینِ ذاتِ حق ہے' بلکہ شیخ کے ہاں صفتِ علم' صفتِ قدرت کا عین اور صفتِ قدرت' صفتِ علم کا عین ہے۔ چونکہ شیخ ابن عربی کے نزدیک صفت علم بھی عینِ ذات ہے لہٰذا صفتِ علم میں تنزل سے مراد عینِ ذات میں تنزل ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے ہاں اللہ کی ذات میں تو تنزل نہیں ہوا لیکن کلمہ 'کُن' یعنی اللہ کی صفت کلام جو نہ عین ذات ہے اور نہ غیر ذات یا من وجہ عینِ ذات ہے اور من وجہ غیر ذات ہے' اس میں تنزل ہوا ہے' لیکن جب اس کلمہ 'کُن' نے تنزلات کی صورت میں مخلوق کی صورت اختیار کی تو اب مخلوق اللہ کا غیر اور حادث ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''لہٰذا ذاتِ باری تعالیٰ کا وہ کلمہ 'کُن' بھی جو موجودہ کون و مکان کے کل سلسلہ تکوین و تخلیق کا نقطہ آغاز بنا' ابتداء میں لازماً 'مطلق' و 'لامحدود' اور 'کیف' و 'کم' کے جملہ تصورات سے ماوراء تھا۔ البتہ اسی کلمہ کُن نے 'تنزلات' کی منزلیں طے کرنی شروع کیں جن کے ذریعے 'وجوب' سے 'امکان' اور 'قدم' سے 'حدوث' کی جانب سفر شروع ہوا۔ گویا تنزلات کی نسبت ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب نہیں اس کلمہ 'کُن' کی جانب ہے''۔ (ایجاد و ابداعِ عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک: ص ۱۰)

چھٹا فرق: شیخ ابن عربی کے نزدیک نظریہ وحدت الوجود ہی حق ہے اور جو علماء' فقہاء حتیٰ کہ صوفیاء تک اللہ کے وجود کے علاوہ دوسرا وجود مانتے ہیں تو ابن عربی کے ہاں ان کی معرفتِ رب ناقص معرفت اور ان کا یہ عمل شرک ہے۔ شیخ ابن عربی کا کہنا ہے کہ جو صوفیاء راہِ سلوک میں اپنے وجود کے فنا ہونے کا نظریہ رکھتے ہیں' ان کا یہ نظریہ بھی شرک ہے' کیونکہ کسی وجود کے فنا کا نظریہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ پہلے اس کے وجود کے قائل ہوں اور یہی شرک ہے۔ ابن عربی کے بقول:

" ومن جوز أن يكون مع الله شيء يقوم بنفسه أو يقوم به وهو فان عن وجوده أو من فنائه ' فهو بعد بعيد' ما شم رائحة معرفة النفس' لأن من جوز أن يكون موجود سواه قائما به وفيه' يصير فانيا' وفنائه يصير فانيا في فنائه ' فيتسلسل الفناء بالفناء' وهذا شرك بعد شرك' وليس معرفة للنفس' لأنه شرك لا عارف بالله' ولا بنفسه."

(كتاب الهُوَ : ص ٥)

''اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی شے کے وجود کو جائز قرار دیا کہ وہ شے بذاتہ قائم ہو یا اللہ کے ساتھ قائم ہو اور وہ شے اپنے وجود کے اعتبار سے فنا ہونے والی ہو یا اس کے فنا سے فنا ہونے والی ہو تو ایسا ہونا بہت دور کی بات ہے اور ایسے شخص نے اپنے نفس کی معرفت کی بو بھی نہیں چکھی' کیونکہ جس نے اللہ کے سوا کسی بھی وجود کو جائز قرار دیا' چاہے وہ وجود اللہ کے ساتھ قائم ہو یا اس میں قائم ہو اور فنا ہو جانے والا ہو اور اس کی فنا بھی اس کی فنا میں فنا ہونے والی ہو تو اس طرح فنا کا تسلسل لازم آئے گا اور یہ شرک پر شرک ہے اور نفس کی معرفت اسے نہیں کہتے کیونکہ یہ شرک ہے اور [وجود کے فنا ہونے کا ایسا نظریہ رکھنے والے صوفی کو] نہ تو اللہ کی معرفت حاصل ہوئی ہے اور نہ ہی اپنے نفس کی۔''

جبکہ ڈاکٹر صاحب' وحدتُ الوجود کے عقیدہ کو ایک زائد عقیدہ سمجھتے ہیں کہ جس کے نہ ماننے سے ان کے نزدیک نہ تو معرفتِ الٰہی میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے اور نہ ہی دین اسلام اور تصورِ توحید ناقص قرار پاتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''خود اس فلسفۂ وجود کے بارے میں بھی میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا تعلق نہ شریعت سے ہے نہ طریقت سے۔ اس فلسفہ کو جس کا جی چاہے قبول کرے اور جو اسے رد کرنا چاہے رد کر دے۔ اس کے نہ ماننے سے کسی اعتبار سے بھی دین میں کوئی کمی یا نقص واقع نہیں ہوتا۔ البتہ تنقید اور اختلاف کے معاملے میں دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جس شخص کے نظریات پر آپ تنقید کر رہے ہیں پہلے اس کے اصل مسلک کو ضرور سمجھ لیں۔'' (اُمّ المسیّحات: ص ۹۱)

ڈاکٹر صاحب کے موقف کے بارے میں کچھ وضاحتیں

ڈاکٹر صاحب کے نکتہ نظر پر نقد سے پہلے چند ایک وضاحتوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے:

پہلا نکتہ: ڈاکٹر صاحب' شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ احمد سرہندی رحمہما اللہ وغیرہ کے توشخصی دفاع کے قائل ہیں اور ان حضرات پر مشرک' کافر یا ضال کا فتویٰ لگانے کے خلاف ہیں' لیکن شیخ ابن عربی پر کوئی فتویٰ لگائے جانے کے بارے وہ حساس نہیں ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ کسی کو ابن عربی سے سوءظن ہو' کوئی انہیں مرتد سمجھے یا جو چاہے کہے اس سے کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا۔ لیکن شاہ ولی اللہ ؒ کو اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ مشرک تھے یا مرتد تھے یا ضال اور مضل تھے تو یہ بات بڑی تشویش کی ہے''۔ (اُمّ المسبّحات: ص ۴۸)

ڈاکٹر صاحب' شیخ ابن عربی پر کوئی فتویٰ لگانے کے بارے میں حساس کیوں نہیں ہیں؟ اس کی ایک وجہ تو ان کے نزدیک ابن عربی کا صرف صوفی ہونا ہے جبکہ شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ اور شیخ احمد سرہندی ؒ کا مقام ابن عربی سے اس لحاظ سے بہت بلند ہے کہ یہ حضرات بیک وقت صوفی ہونے کے ساتھ فقیہہ' محدّث اور مفسّر بھی ہیں اور ان کی دینی خدمات بھی ناقابل بیان ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''ابن عربی کو تو خیر چھوڑ دیجیے کہ ان کی حیثیت کسی مفسّر' محدّث یا فقیہہ کی نہیں ہے''۔ (اُمّ المسبّحات: ص ۴۸)

دوسرا نکتہ: ڈاکٹر صاحب کو شیخ ابن عربی سے صرف ایک ہی بات میں اتفاق ہے۔ اس کے علاوہ وہ شیخ ابن عربی کی طرف منسوب جملہ خرافات' شرکیہ کلمات اور بدعات سے اعلان براءت کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''شیخ ابن عربی کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ جہاں تک حقیقت و ماہیتِ وجود کے بارے میں ان کی رائے کا تعلق ہے' تو میں اس سے متفق ہوں اور میرا مسلک بھی وہی ہے۔ البتہ اور بہت سی باتیں' خواہ انہوں نے لکھیں یا ان کی طرف غلط منسوب کر دی گئیں' ان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا میں نہ تو ان کے بارے میں جواب دہ ہوں' نہ ان کی وضاحت میرے ذمہ ہے اور نہ ہی مجھے ان کے وکیل کی حیثیت حاصل ہے۔'' (اُمّ المسبّحات: ص ۹۱)

تیسرا نکتہ: ڈاکٹر صاحب نے شیخ ابن عربی کی جس ایک بات سے اتفاق کیا ہے ہم اس ایک بات کے بارے میں بھی یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ اس بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب مغالطے کا شکار تھے' اس لیے کہ یہ شیخ ابن عربی کی بات نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر صاحب نے چونکہ کچھ ثانوی ذرائع سے شیخ ابن عربی کے نظریہ وحدتُ الوجود کو سمجھا لہٰذا انہوں ابن عربی کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر دی جو اُن کی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ابن عربی کی کتب کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ایک جگہ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''باقی میں نے نہ فصوص الحکم کا مطالعہ کیا ہے' نہ فتوحاتِ مکیہ کا''۔ (اُمّ المسبّحات: ص ۸۸)

یہ تو شیخ ابن عربی کی بنیادی دو کتابیں شمار ہوتی ہیں' ویسے شیخ کی طرف تقریباً ۲۰۰ سے ۸۰۰ کتب اور رسائل منسوب ہیں جن میں ۷۰ سے زائد شائع ہو چکی ہیں اور ان سب کا موضوع تقریباً تصوّف اور وحدتُ الوجود ہی ہے۔ ۴۰ کے قریب شیخ کی مطبوعہ کتب و رسائل تو راقم نے بھی اب تک جمع کر لیے ہیں۔

چوتھا نکتہ: ڈاکٹر صاحب عقیدۂ وحدت الوجود کو کوئی بنیادی عقیدہ نہیں سمجھتے اور اس کے ساتھ اختلاف کو شرعی تقاضوں کے مطابق صحیح سمجھتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''اس فرق کو ملحوظ رکھیے' اس کے بعد جی میں آئے تو آپ اس نظریے کو اٹھا کر پھینک دیں' آپ کو وہ ناقابل قبول نظر آئے تو بالکل ٹھکرا دیں۔ ہمیں بڑے سے بڑے شخص سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اختلاف نہیں کر سکتے تو محمد رسول اللہ ﷺ سے نہیں کر سکتے' باقی ہر شخص سے اختلاف ہو سکتا ہے۔''

(اُمّ المسیحات: ص ۵۵)

پانچواں نکتہ: ڈاکٹر صاحب' وحدت الوجود کے نظریہ کے داعی نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے بعض دروس میں جو اسے بیان کیا ہے تو اس کا مقصد کسی تصورِ توحید یا اسلامی عقائد کی تکمیل نہیں' بلکہ کچھ نمایاں علماء' فقہاء اور محدثین مثلاً شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ وغیرہ سے سوئے ظن کو ختم کرنا تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''اس سلسلہ میں آخری بات یہ عرض کر رہا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے حضرات کا شاید یہ ذوق نہ ہو' اس کے باوجود میں یہ مسئلہ اس لیے بیان کر دیا کرتا ہوں کہ ان بزرگوں اور اسلاف کے بارے میں سوئے ظن نہ رہے جو وحدت الوجود کے قائل ہیں''۔ (اُمّ المسیحات: ص ۹۴)

چھٹا نکتہ: وحدت الوجود کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب جو کچھ بیان کرتے رہے ہیں' وہ ڈاکٹر صاحب کا ذاتی رجحان و میلان تھا۔ اس کا تنظیم اسلامی کے بنیاد عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا بعض سلفی بھائی' ڈاکٹر صاحب کے اس نکتہ نظر کی وجہ سے تنظیم اسلامی کو جو ہدفِ تنقید بناتے ہیں' درست طرزِ عمل نہیں ہے۔

ساتواں نکتہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب' اللہ کی ذات میں تنزل کے قائل نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب' اللہ کے اَسماء میں بھی تنزل کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ ابن عربی کا معاملہ ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب' اللہ کی جمیع صفات میں سے صرف صفت کلام میں تنزل کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ صفت کلام میں بھی کل صفتِ کلام نہیں بلکہ اُس کے ایک 'کلمہ کُن' میں تنزل کے قائل نظر آتے ہیں۔ پانچویں بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس 'کلمہ کُن' میں تنزل کے قائل ہیں وہ ان کے نزدیک اصل کے اعتبار سے تو اللہ کی صفت ہے لیکن تنزلات کے مراحل طے کرنے کے بعد وہ اللہ کی صفت نہیں رہا بلکہ حادث بن گیا۔

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہی ہے کہ شیخ ابن عربی کا وحدت الوجود کا جو نکتہ نظر ہے' یہ وہ نظریہ نہیں ہے جو ڈاکٹر اسرار صاحب رحمہ اللہ کا ہے' بلکہ دونوں نظریات میں کئی اعتبارات سے بنیادی فرق موجود ہے۔ لہٰذا شیخ ابن عربی پر کبار سلفی علماء کی تنقید کو ڈاکٹر صاحب پر چسپاں کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب اسے دین و مذہب یا عقیدے کا معاملہ نہیں سمجھتے بلکہ فلسفہ و سائنس کا مسئلہ گردانتے ہیں۔ نیز یہ وحدت الوجود یا ربط الحادث بالقدیم کی ایک نئی تعبیر ہے۔ اگرچہ 'کلمہ کُن' کے مخلوق بن جانے کا تصور نیا نہیں ہے بلکہ یہ عیسائی فلاسفرز میں زمانہ قدیم سے موجود ہے' جیسا کہ مولانا مودودیؒ نے قرآنی الفاظ: 'اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ' کی تفسیر کرتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

بہر حال اس تعبیر میں بھی خطا کا امکان تو رد نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اس خطا کے پہلو کو ثابت کرنے کے لیے پہلے اس تعبیر کو اچھی طرح سمجھنا ضرور چاہیے۔ علاوہ ازیں یہ بھی واضح رہے کہ اس مختصر سی تحریر کا مقصد نہ تو شیخ ابن عربی کے موقف کی حمایت ہے اور نہ ہی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے نکتہ نظر کا دفاع۔ اس تحریر کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ جس نے بھی کتاب وسنت کی روشنی میں ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے موقف پر نقد کرنی ہو وہ پہلے ان کے موقف کو اچھی طرح سمجھے اور پھر نقد کرے۔ اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے نکتۂ نظر کو عقیدے کے کسی مسئلہ کے طور پر پیش نہیں کیا کہ جس کے ردّ وقبول سے ایمان وکفر کا معاملہ لازم آتا ہو' بلکہ اسے ربط الحادث بالقدیم کی ایک سائنسی توجیہہ کے طور پر پیش کیا ہے' جسے جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے رد کرے' بغیر اس کے کہ رد کرنے سے اس کے ایمان پر کوئی زد پڑتی ہو۔

رہے وہ لوگ جو ڈاکٹر صاحب کی اس توجیہہ وتاویل کی بنا پر ان کے ایمان کی نفی کرتے ہیں تو ان کے ضمن میں خیال رہے کہ اوّلاً انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے پیش کردہ نظریئے کو درست طور پر سمجھا ہی نہیں' جبھی تو وہ انہیں شیخ ابن عربی کا ہم خیال گردانتے ہوئے تکفیر سے نیچے کی بات ہی نہیں کرتے' اور ثانیاً یہ کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی بیان کردہ توجیہہ کو ان کے عقیدے کا لازمی عنصر گردانتے ہیں' حالانکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا' ڈاکٹر صاحب اپنی پیش کردہ تاویل کو واضح طور پر قابل ردّ وقبول بھی بیان کرتے ہیں' اور اس سے اختلاف کرنے کا حق بھی اہلِ علم کو دیتے ہیں۔

جہاں تک اس مسئلے میں راقم کے ذاتی نکتہ نظر کا معاملہ ہے تو وہ اس باب میں اس مسلک کا حامل ہے' جس کی بنیاد ائمہ اربعہ اور صاحبین رحمہم اللہ اجمعین نے رکھی اور وہ صحابہ وتابعین سلف صالحین کی طرف منسوب ہے اور انہی کی نسبت سے اب 'سلفیہ' کے مکتب فکر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سلف صالحین کا یہ نکتہ نظر 'توحید اسماء وصفات' کے عنوان سے بلاشبہ سینکڑوں نہیں ہزاروں کتب' تحقیقی مقالہ جات اور رسائل میں موجود ہے جن میں سے کئی ایک بنیادی کتب کے مصنفین متقدّمین فقہائے حنفیہ اور کبار محدّثین کرام کی جماعت ہے۔ ائمہ اربعہ اور محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں ہے اور عرش پر مستوی ہے اور یہی حق ہے اور اس کی دلیل میں قرآن وسنت کی ۶۰۰ نصوص ہیں جن کی تاویل ممکن نہیں ہے۔ جب اس بنیادی عقیدے کو مان لیا جائے تو پھر وحدتُ الوجود ہو یا وحدتُ الشہود ان بحثوں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

❁❁❁

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی لاہور کی تازہ ترین پیشکش

- اسلام کیا ہے؟
- ایمان کی حقیقت کیا ہے؟......اور
- احسان سے کیا مراد ہے؟

ان سوالوں کی وضاحت پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے چار خطابات جمعہ پر مشتمل کتاب

"اسلام ' ایمان اور احسان

حدیثِ جبریلؑ کی روشنی میں"

زیور طبع سے آراستہ ہوگئی ہے

☆عمدہ طباعت ☆دیدہ زیب ٹائٹل ☆صفحات:72 ☆قیمت:50روپے

مکتبہ خُدّام القُرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔
فون:3-042-35869501
email: maktaba@tanzeem.org

گھریلو تشدّد کی روک تھام کی تدابیر

عصری قوانین اور قرآنی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ

محمد رضی الاسلام ندوی ☆

تحریک آزادئ نسواں سے عورتوں کو اگرچہ بعض فوائد حاصل ہوئے ہیں، لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس نے مردوں اور عورتوں کو مدمقابل لا کھڑا کیا۔ نظامِ خاندان میں دونوں کی حیثیت رفیق (partner) اور حلیف (ally) کی تھی اور دونوں کو مل کر تمدن کی گاڑی کھینچنی تھی۔ اسی بنا پر فطرت کی طرف سے دونوں میں ایک دوسرے سے محبت، ہمدردی، اپنائیت اور غم گساری کے جذبات ودیعت کیے گئے تھے۔ تحریکِ آزادئ نسواں نے دونوں کو فریق (party) اور حریف (rival) بنا دیا اور اپنے لیے زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کرنا اور دوسرے کے جائز حقوق کو بھی تسلیم نہ کرنا اس تحریک کا مطمحِ نظر بن گیا۔

پھر جب مرد اور عورت دونوں فریق بن گئے تو مرد اپنے حقوق حاصل کرنے اور عورت پر اپنا تسلّط جمانے میں پیچھے کیوں رہے؟ اس کے لیے اس نے اپنے دست و بازو کو بھی استعمال کیا۔ گھر کی چار دیواری میں یوں بھی باہر کے لوگوں کا زور نہیں چلتا، عملاً اقتدار مرد کو حاصل رہتا ہے، چنانچہ مرد نے اپنے اس اقتدار کا خوب خوب استعمال کیا۔ عورت جب زبانی تنبیہ و سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے اس کے قابو میں نہیں آئی تو اس نے زور بازو کا استعمال شروع کر دیا۔ مار کھانا عورت کا مقدر ٹھہرا۔ عہدِ قدیم میں بھی وہ مرد کی جانب سے جسمانی اذیتوں کا شکار تھی اور عہدِ جدید میں بھی اس کے حقوق کی طویل فہرست بن جانے کے باوجود اسے اذیتوں سے راحت نہ مل سکی۔

گھریلو تشدّد: عالمی صورت حال

حقوقِ نسواں کے علم برداروں نے اس صورت حال کا جائزہ لینے، اس میں سدھار پیدا کرنے اور عورت کو اس سے نجات دلانے کے لیے ایک خاص اصطلاح وضع کی ہے اور وہ ہے ''گھریلو تشدّد'' (domestic violence)۔ اس سے وہ کیا مراد لیتے ہیں، اس کا اندازہ اس کی تعریف سے کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کے ایک سرکاری ادارے US Office on Violence against Women نے گھریلو تشدّد کی یہ تعریف کی ہے:

"Pattern of abusive behavior in any relationship that is used by one partner to gain or maintain power and control over another intimate partner." (1)

''دو قریبی افراد (یعنی مرد و عورت) جو کسی بھی رشتہ میں منسلک ہوں، ان میں سے ایک کی جانب سے

☆ معاون مدیر، سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ

بدسلوکی کا رویہ جو وہ دوسرے کے مقابلے میں طاقت اور اس پر کنٹرول حاصل کرنے یا برقرار رکھنے کے لیے ظاہر کرے۔''

الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہی تعریف برطانیہ کے سرکاری ادارے The Children and Family Court Advisory and Support Service کی دستاویز Domestic Violence Assessment Policy میں بھی ملتی ہے۔(۲)

اس تعریف کا اطلاق یوں تو ایک ساتھ رہنے والے کسی بھی مرد وعورت پر ہوسکتا ہے' خواہ ان کے مابین کوئی بھی رشتہ ہو' لیکن عموماً اس سے مراد وہ مرد وعورت لیے جاتے ہیں جو رشتہ ازدواج میں منسلک ہو کر یا اس کے بغیر میاں بیوی کے طور پر رہتے ہیں۔

گھریلو تشدد کی مختلف صورتیں بتائی گئی ہیں۔ یہ جسمانی (physical) بھی ہوسکتا ہے کہ فریقین میں سے کوئی دوسرے کو جسمانی طور پر اذیت دے' اسے مارے پیٹے' جس سے اس کا بدن زخمی ہو جائے۔ جنسی (sexual) بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر بہ جبر اس سے جنسی تعلق قائم کرے۔ مالی (financial) بھی ہوسکتا ہے کہ وہ جو کچھ کمائے دوسرا فریق اس پر قبضہ کر لے اور اسے اپنی مرضی سے خرچ نہ کرنے دے۔ سماجی (social) بھی ہوسکتا ہے کہ اسے اپنے سے حقیر سمجھے اور دوسروں کے سامنے اسے ذلیل کرے۔ جذباتی (emotional) بھی ہوسکتا کہ کوئی ایسا کام کرے جس سے دوسرے فریق کے جذبات مشتعل ہوں' اسے غصہ آئے یا وہ رنج وغم میں مبتلا ہو۔ نفسیاتی (psychological) بھی ہوسکتا ہے کہ اسے ڈرائے دھمکائے' یا اپنی باتوں سے اسے اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کرے۔ یہ تمام صورتیں گھریلو تشدد کے دائرے میں آتی ہیں۔

سماجی طور پر دیکھیں تو موجودہ دنیا کا سب سے گھمبیر مسئلہ گھریلو تشدد ہے۔ کوئی ملک اس سے محفوظ نہیں۔ تمام سماجوں' نسلوں اور طبقات میں یہ عام ہے۔ ۱۹۹۹ء میں ۳۵ ممالک میں کرائے گئے سروے سے واضح ہوا تھا کہ ۵۲ فی صد عورتیں زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے intimate partners (یعنی شوہر یا جن کے ساتھ وہ بیویوں کی حیثیت سے رہتی ہیں) کی جانب سے تشدد کا شکار ہوئی تھیں۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو دنیا کی ایک تہائی عورتیں گھریلو تشدد کا شکار ہوتی ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت (WHO) کی ایک رپورٹ بتاتی ہے کہ پوری دنیا میں مقتول ہونے والی عورتوں میں سے چالیس فی صد ایسی ہوتی ہیں جن کے قتل کرنے والے ان کے شوہر یا بوائے فرینڈ ہوتے ہیں۔ ورلڈ بینک کی ایک رپورٹ میں عورتوں کے اسبابِ موت میں گھریلو تشدد کو کینسر کی طرح خطرناک قرار دیا گیا ہے۔

اس مظہر پر اقوام متحدہ کے ایک نمائندہ Yakin Erturk (Special rapporteur on violence against women) نے یوں روشنی ڈالی ہے:

"Violence against women is a universal phenomenon that persists in all countries of the world, and the perpetrators of that violence are often wellknown to their victims" (3)

''عورتوں کے خلاف تشدد ایک عالمی مظہر ہے جو دنیا کے تمام ممالک میں پایا جاتا ہے۔ اس تشدد کا ارتکاب کرنے والے عام طور سے ان مظلومین کے نزدیک معروف ہوتے ہیں۔''

صورت حال کے جائزے اور تدارک کے لیے عالمی کوششیں

گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی سے نسائی تحریکات کی جانب سے عورتوں کے خلاف گھریلو تشدد کے مسئلے پر توجہ دی گئی اور اسے ایک عالمی مسئلہ کی حیثیت سے ابھار کر پیش کیا گیا۔ اقوام متحدہ نے اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس سے متعلق مختلف قراردادیں منظور کیں اور ممبر ممالک کو ان کا پابند کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۹۲ء میں UN Commission on the Status of Women نے ایک اسپیشل ورکنگ گروپ بنایا اور اسے اختیار دیا کہ وہ ''عورتوں کے خلاف تشدد پر اعلامیہ'' (Decleration on Violence against Women) کا ایک ڈرافٹ تیار کرے۔

۱۹۹۳ء میں UN Commission for Human Rights نے ایک قرارداد منظور کی جس میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور تشدد کی تمام شکلوں' خاص طور پر خواتین کے خلاف تشدد کی مذمت کی گئی تھی۔

اسی سال ویانا میں حقوقِ انسانی پر بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی' جس میں عورتوں کے خلاف تشدد کا خاتمہ کرنے کے لیے جامع منصوبہ بندی کی گئی۔ اس موقع پر ایک اعلامیہ منظور کیا گیا جسے ''عورتوں کے خلاف تشدد کے خاتمہ کا اعلامیہ'' (Decleration on the Elimination of Violence against Women) نام دیا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اقوام متحدہ اور اس کے ممبر ممالک پبلک لائف اور پرائیوٹ لائف دونوں سے عورتوں کے خلاف تشدد' جنسی ایذا رسانی اور نظام عدل میں صنفی تفریق کے خاتمہ کے لیے کام کریں گے۔ یہ اعلامیہ بین الاقوامی سطح پر حقوق انسانی کی پہلی دستاویز تھا جس میں گھریلو تشدد کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اس میں زور دے کر یہ بات کہی گئی تھی کہ گھریلو تشدد عورت کے انسانی حقوق اور اس کو حاصل بنیادی آزادی کے خلاف ہے۔

۱۹۹۴ء میں UN Commission for Human Rights نے ایک قرارداد منظور کی کہ ایک اسپیشل rapporteur کا تقرر کیا جائے جو گھریلو تشدد کے اسباب وعواقب کا جائزہ لے۔ اس کا کام یہ طے کیا گیا کہ وہ جامع طور سے بین الاقوامی سطح پر عورتوں کے خلاف تشدد کے اعداد وشمار جمع کر کے ان کا تجزیہ کرے اور تشدد روکنے کی تدابیر بتائے۔

۱۹۹۵ء میں بیجنگ (چین) میں 4th World Conference on Women منعقد ہوئی۔ اس میں عورتوں کے خلاف تشدد کو ایک نازک اور سنگین مسئلہ قرار دیا گیا جو فوری توجہ کا متقاضی ہے۔ اس وقت کے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بطرس غالی (Boutros-Ghali) نے صورت حال کی سنگینی کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''عورتوں کے خلاف تشدد ایک عالمی مسئلہ ہے جو مسلسل بڑھ رہا ہے''۔ اس موقع پر تشدد روکنے کے لیے platform for action تجویز کیا گیا۔

۱۹۹۶ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے UN Trust Fund قائم کیا' جس کا مقصد عورتوں کے خلاف تشدد روکنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرنا تھا۔

دس ممالک میں اقوام متحدہ کا سروے

۱۹۹۷ء میں اقوام متحدہ نے عورتوں کے خلاف تشدّد کے سلسلے میں دنیا کے دس ممالک کا سروے کرایا۔ اس سروے کی رپورٹ The WHO Multi-country Study on Women's Health and Domestic Violence against Women کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ اس رپورٹ نے عالمی سطح پر عورتوں کے خلاف گھریلو تشدّد کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کا خلاصہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس سروے کا مقصد یہ جائزہ لینا تھا کہ عورتوں پر ان کے intimate partner کی جانب سے کتنا تشدّد ہوتا ہے اور اس کا ان کی صحت پر کتنا اثر پڑتا ہے؟ سروے میں جن ممالک کو شامل کیا گیا ان کے نام یہ ہیں: (۱) بنگلا دیش (۲) برازیل (۳) ایتھوپیا (۴) جاپان (۵) نامیبیا (۶) پیرو (۷) سموا (۸) سربیا و مونٹے نیگرو (۹) تھائی لینڈ (۱۰) تنزانیا۔ سروے کے لیے انہی ممالک کو کیوں منتخب کیا گیا اس کی وجہ رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ وہاں عورتوں کے خلاف تشدد کے اعداد و شمار پہلے موجود نہیں تھے اور مقامی طور پر وہاں ایسے تشدد مخالف گروپ (Anti-Violence groups) سرگرم تھے جو یہ اعداد و شمار صورت حال کی بہتری اور تشدد کی روک تھام کے لیے استعمال کر سکتے تھے' نیز وہاں ایسا سیاسی ماحول بھی پایا جاتا تھا جو اس مسئلہ سے بخوبی نمٹ سکتا تھا۔

ان دس ممالک کے پندرہ مقامات پر چوبیس ہزار عورتوں سے تشدد کی مختلف صورتوں (جسمانی' جنسی' نفسیاتی وغیرہ) سے متعلق سوالات کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ زیر سروے تمام ممالک میں گھریلو تشدد وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اس کا تناسب سب سے کم (۱۵٪) جاپان میں اور سب سے زیادہ (۷۱٪) بنگلا دیش' ایتھوپیا' پیرو اور تنزانیا میں ہے۔ زیادہ تر علاقوں میں تشدد کا تناسب ۲۹ سے ۶۲ فی صد کے درمیان تھا۔ جسمانی تشدد میں تھپڑ مارنا' کوئی چیز پھینک کر زخمی کر دینا' لات گھونسہ مارنا' ڈنڈے سے پٹائی کرنا اور بندوق یا کسی دوسرے ہتھیار سے نقصان پہنچانا' جنسی تشدد میں عورت کی مرضی کے علی الرغم یا اسے خوف زدہ کر کے جنسی تعلق قائم کرنا' نفسیاتی تشدد میں تذلیل و تحقیر کرنا اور ڈرانا دھمکانا شامل ہے۔ سروے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عموماً ۱۵ سے ۱۹ سال کی عورتیں جسمانی اور جنسی تشدد کا زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ تشدد سے عورتوں کی صحت پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان کے اعضائے بدن پر خراشیں اور چوٹیں آتی ہیں' آنکھ' ناک' کان زخمی ہو جاتے ہیں' ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ زیادہ تر عورتوں کو دوران حمل بھی پیٹا گیا' جس کے نتیجے میں ان کی دماغی صحت بھی متاثر ہوئی' چنانچہ ان میں سے بہت سوں نے مار کھانے کے بعد خودکشی کا ارادہ کیا۔

اس سروے کا خلاصہ عورتوں کے خلاف تشدد کے اسپیشل رپورٹر Yakin Ertusk کے الفاظ میں یہ ہے:

"This study challenges the perception that home i s a safe h eaven for women by showing that women are more at risk of experiencing violence in intimate relationship than any where else." (4)

''یہ مطالعہ اس گمان کو چیلنج کرتا ہے کہ گھر عورتوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ ہے۔ اس لیے کہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے دوسروں کی بہ نسبت اپنے قریب ترین رشتہ داروں کی جانب سے تشدد کا زیادہ خطرہ رہتا ہے۔''

دیگر ممالک کا جائزہ

یہ محض گنتی کے چند ملکوں کا معاملہ نہیں ہے' بلکہ دنیا کے تمام ممالک اس تشویش ناک صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ ان میں وہ ممالک بھی ہیں جن کے باشندوں کا تہذیبی وسماجی شعور زیادہ بلند نہیں ہے اور وہ ممالک بھی ہیں جنھیں عصرِ حاضر میں تہذیب وتمدن کا امام سمجھا جاتا ہے۔ ہر جگہ عورتیں بری طرح ظلم وتشدد کا شکار ہیں اور ان پر ظلم ڈھانے والے کوئی اور نہیں ان کے شوہر' سابق شوہر' بوائے فرینڈ یا دیگر قریبی افراد ہیں۔

۲۰۰۲ء میں WHO کی ایک رپورٹ کے مطابق آسٹریلیا' کینیڈا' اسرائیل' جنوبی افریقہ اور امریکہ میں کیے گئے مطالعات سے معلوم ہوا کہ مقتول عورتوں کی ۴۰ سے ۷۰ فی صد تعداد ان عورتوں کی تھی جو اپنے intimate partners کے ذریعے قتل کی گئیں۔ بعض سروے رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عورتیں اپنے گھروں میں قریبی افراد' مثلاً شوہروں کے ذریعہ تشدد کا شکار ہوتی ہیں ان کا تناسب سویڈن میں ۷۰ فی صد' جارجیا میں ۵۰ فی صد' ڈومینیکین ریپبلک (Dominican) میں ۴۸ فی صد' بوٹسوانا (Botswana) میں ۶۰ فیصد' بارباڈوس (Barbados) میں ۳۰ فی صد' مصر میں ۳۴ فی صد اور نیوزی لینڈ میں ۳۵ فی صد ہے۔ یورپی ممالک میں گھریلو تشدد کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر ۲۰۰۲ء میں کونسل آف یورپ نے گھریلو تشدد کو پبلک ہیلتھ ایمرجنسی ڈکلیر کر دیا۔

پوری دنیا میں گھریلو تشدد کے جتنے واقعات رپورٹ ہوتے ہیں' ان میں سے ایک تہائی تعداد امریکہ اور برطانیہ کی ہوتی ہے۔ ۲۰۰۰ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق امریکہ میں ہر سال تقریباً ۱۳ لاکھ عورتیں اپنے قریبی رفقاء (intimate partners) کے ذریعے جسمانی تشدد اور ایذا رسانی کا شکار ہوتی ہیں۔[۵] ۲۰۰۰ء میں جتنی عورتیں اسلحہ کے ذریعے قتل کی گئیں ان کی دو تہائی تعداد ان عورتوں کی تھی جنھیں قتل کرنے والے ان کے intimate partners تھے۔ U.S. Department of Justice کے مطابق ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۲ء کے درمیان فیملی ممبرز کے خلاف تشدد کے ۳۵ لاکھ واقعات رپورٹ کیے گئے۔ ان میں سے ۴۹ فی صد واقعات زوجین (spouses) کے خلاف تشدد کے تھے اور ان میں بھی ۸۴ فی صد تعداد عورتوں کی تھی جو مردوں کے ہاتھوں تشدد اور بدسلوکی کا شکار ہوئی تھیں۔ اپنے جوڑے کے ساتھ بدسلوکی کے الزام میں جو لوگ جیل میں بند تھے ان میں سے ۵۰ فی صد وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے جوڑے کو قتل کر دیا تھا اور مقتول ہونے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔[۶]

۱۹۹۲ء کی ایک رپورٹ کے مطابق انگلینڈ میں گھریلو تشدد کا شکار ہونے والی عورتوں کا تناسب ۲۵ فی صد تھا[۷]۔ پولیس کو رپورٹ ہونے والے Violence Crimes میں سے ۲۵ فی صد سے زائد گھریلو تشدد سے

متعلق ہوتے ہیں۔ مقتول ہونے والی عورتوں میں سے ۴۰ سے ۴۵ فی صد وہ عورتیں ہوتی ہیں جنھیں قتل کرنے والے ان کے male partners ہوتے ہیں[۸]۔ ماضی قریب کی ایک رپورٹ کے مطابق انگلینڈ اور Wales میں ہر ہفتہ دو عورتیں موجودہ یا سابق male partners کے ذریعے ہلاک کردی جاتی ہیں اور ہر منٹ میں گھریلو تشدد کا ایک کیس رپورٹ کیا جاتا ہے[۹]۔ اسکاٹ لینڈ میں ۲۰۰۷-۲۰۰۶ء میں گھریلو تشدد کے تقریباً ۴۹ ہزار کیس درج کیے گئے۔ ان میں سے ۸۷ فی صد کیس ایسے تھے جن میں عورتیں ظلم و تشدد کا شکار بنی تھیں اور ان میں بھی ۹۰ فی صد واقعات متاثرہ عورتوں کے گھر میں پیش آتے تھے۔

برصغیر کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ Human Rights Watch کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ۹۰ فی صد عورتیں اپنے گھروں میں جسمانی، جنسی اور نفسیاتی تشدد کا شکار بنتی ہیں۔ Human Rights Commission of Pakistan کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۳ء میں صوبۂ پنجاب میں گھریلو تشدد کے ۴۰۰ کیس ریکارڈ کیے گئے، جن میں سے نصف بیویوں کے قتل کے تھے۔

UN Population Fund کی ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں ۷۰ فی صد شادی شدہ عورتیں ۱۵ سے ۴۹ سال کی عمر میں گھریلو تشدد کا شکار بنتی ہیں، ان کی پٹائی کی جاتی ہے اور ان کے ساتھ بہ جبر جنسی تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں روزانہ ۱۴ عورتیں اپنے شوہروں کے ہاتھوں موت کا شکار ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے National Crime Record Bureau سے معلوم ہوتا ہے کہ پولیس ریکارڈ کے مطابق ہر تین منٹ میں ایک عورت سے ارتکابِ جرم ہوتا ہے اور ہر چھ گھنٹے میں ایک شادی شدہ عورت کی، پٹائی سے موت ہو جاتی ہے، یا اسے زندہ جلا دیا جاتا یا خودکشی پر مجبور کیا جاتا ہے۔

گھریلو تشدد کی روک تھام کے لیے عصری قوانین

گھریلو تشدد کی اس انتہائی سنگین صورت حال نے سماجی مصلحین، سیاسی زعماء، قانون بنانے والی شخصیات اور اسے نافذ کرنے والے اداروں، سب کو پریشان کر رکھا ہے اور وہ اس کے تدارک کے لیے جی جان سے لگے ہوئے ہیں۔

۱۹۹۹ء سے ہر سال اقوام متحدہ کی جانب سے ۲۵ رنومبر کو عورتوں کے خلاف تشدد کے خاتمہ کے بین الاقوامی دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، جس میں اس معاملے میں بیداری لانے اور گھریلو تشدد کی روک تھام کے لیے مختلف پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔

اقوام متحدہ کی جانب سے اس موضوع پر عالمی سطح کی کئی کانفرنسیں منعقد ہوئی ہیں، متعدد اعلامیے منظور کیے گئے ہیں اور ممبر ممالک کو عورتوں کے خلاف تشدد روکنے کے لیے قوانین بنانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس میدان میں اب تک کتنی پیش رفت ہوئی ہے اس کا اندازہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی ایک رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے ۲۰۰۶ء میں In-Depth Study on All Forms of Violence against Women کے عنوان سے پیش کی تھی۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ۸۹ ممالک نے عورتوں کے خلاف تشدد

کے سلسلے میں Lagislative Provisions بنائے ہیں‘ان میں سے ۶۰ ممالک ایسے ہیں جنھوں نے Special Domestic violence Laws وضع کیے ہیں۔اس کے علاوہ بہت سے ممالک نے گھریلو تشدد ختم کرنے کے لیے National Plan of Action تیار کیے ہیں۔ یہ صورت حال ۲۰۰۳ء کے مقابلے میں بہتر ہے‘جب UNIFEM نے Anti-Violence Lagislation کا ایک Scan تیار کیا تھا تو اس سے معلوم ہوا تھا کہ صرف ۴۵ ملکوں نے گھریلو تشدد کے سلسلے میں خصوصی قوانین بنائے ہیں۔

حالیہ برسوں میں گھریلو تشدد روکنے کے لیے ہندوستان میں ایک قانون منظور کیا گیا ہے۔ اس کا نام ہے : The Protection of Women from Domestic Violence Act 2005۔یوں تو ایک دہائی قبل سے اس پر کام ہو رہا تھا۔۱۹۹۲ء میں ہندوستانی وکلاء نے گھریلو تشدد کے موضوع پر ایک ابتدائی ڈرافٹ تیار کیا تھا‘ پھر ۱۹۹۴ء میں National Commission for Women (NCW) نے ایک بل تیار کیا۔ بعد میں ہندوستانی وکلاء نے نسائی تحریکات کے رہنماؤں کی مشاورت سے ۱۹۹۹ء میں ایک دوسرا بل تیار کیا۔حکومت ہند نے ۲۰۰۱ء میں پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا جس کا نام The Protection from Domestic Violence Bill 2001 تھا۔کئی بار کی بحث وتمحیص اور نظرِ ثانی کے بعد اگست ۲۰۰۵ء میں اسے پارلیمنٹ نے منظور کیا‘ ستمبر ۲۰۰۵ء میں صدر جمہور یہ نے اس پر دستخط کیے اور ۲۶/اکتوبر ۲۰۰۶ء سے ایکٹ کی صورت میں اس کا نفاذ ہوا۔

اس قانون کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) اس کے دائرہ میں تشدد کی تمام صورتوں (زبانی‘ جسمانی‘ جنسی‘ نفسیاتی‘ معاشی وغیرہ) کو شامل کیا گیا ہے۔تشدد کی ہر وہ صورت‘ جس سے عورت کو جسمانی یا نفسیاتی طور پر اذیت پہنچے یا اس کی صحت یا زندگی کو خطرہ لاحق ہو‘اس میں شامل ہے۔

(۲) اس سے فائدہ اٹھانے کا حق صرف بیوی ہی کو نہیں‘ بلکہ اس عورت کو بھی ہوگا جو غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود کسی مرد کے ساتھ رہتی ہو اور اس سے اس کا جنسی تعلق ہو۔

(۳) نہ صرف شوہر یا male partner بلکہ اس کے قریبی رشتہ داروں: ماں‘ بہن وغیرہ کے خلاف بھی کیس فائل کیا جاسکتا ہے۔

(۴) صرف مظلومہ ہی نہیں‘ بلکہ اس کا پڑوسی‘ رشتہ دار یا کوئی بھی سماجی کارکن اس کی طرف سے کیس درج کرا سکتا ہے۔

(۵) مظلومہ اپنے partner کے جس گھر میں رہتی ہے‘ عدالت اس کا ایک حصہ اس کے استعمال کے لیے خاص کردے گی اور ملزم کو نہ صرف یہ کہ اس الاٹ شدہ حصہ میں جانے کی اجازت نہ ہوگی‘ بلکہ مظلومہ سے زبانی‘ تحریری‘ فون یا ای میل سے کسی طرح کا رابطہ کرنا اس کے لیے ممنوع ہوگا۔

(۶) مجسٹریٹ نہ صرف یہ کہ مظلومہ کے گزارہ کے لیے ماہانہ ایک رقم متعین کردے گا‘ جس کی ادائیگی ملزم کے ذمے ہوگی‘ بلکہ تشدد کے نتیجے میں مظلومہ کو پہنچنے والی جراحت‘ خواہ وہ جسمانی ہو یا نفسیاتی‘ اس کا ہرجانہ بھی ملزم پر عائد کرے گا۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

مذکورہ قانون کی تفصیلات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گھریلو تشدد کی روک تھام کے لیے اس میں کتنی سختی رکھی گئی ہے۔ لیکن کیا یہ عورت کے درد کا درماں بن سکا؟ اس سے پراپرٹی کی مالک upper class کی بعض عورتوں کا تو فائدہ اٹھانا ممکن ہوا کہ وہ اپنے شوہروں پر جھوٹے سچے الزامات لگا کر انہیں پریشان کرتی رہیں[10]۔ اور نسائی تحریکات کے ان علم برداروں کی بھی باچھیں کھل گئیں جو عورت کی مظلومیت کا تمام تر ذمہ دار مرد اور اس کے خاندان والوں کو سمجھتے ہیں، لیکن عام عورتوں کی غالب اکثریت کو اس سے کچھ حاصل نہ ہوسکا، وہ اب بھی تشدد کا شکار ہیں۔ یہی حال دوسرے ممالک کا بھی ہے، کہ وہاں تشدد روکنے کی ہزار ہا کوششوں کے باوجود اس میں کامیابی نہیں مل رہی ہے۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ۱۳/ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو پیش کی گئی اقوام متحدہ کی ایک حالیہ رپورٹ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

"Despite efforts by governments and compaigns carried out by international organizations, violence against women continued on a wide scale in both developed and developing countries" (11)

''حکومتوں کی کوششوں اور بین الاقوامی تنظیموں کی مہمات کے باوجود عورتوں کے خلاف تشدد ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں طرح کے ملکوں میں بڑے پیمانے پر برابر جاری ہے۔''

غلط تشخیص، غلط علاج

گھریلو تشدد روکنے کے لیے بین الاقوامی سطح پر کی جانے والی کوششوں، حکومتوں کی مساعی اور نسائی تحریکات کی مہمات کے باوجود اس میں کمی نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ مسئلہ کی غلط تشخیص کی گئی اور مرض کا غلط طریقے سے علاج کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ خیال کیا گیا کہ عورتوں کی مظلومیت کا سبب انہیں مردوں کے مساوی اور ان کے جیسے حقوق حاصل نہ ہونا ہے، چنانچہ تحریکیں چلا کر انہیں بھی وہ تمام حقوق دلائے گئے جن سے مرد بہرہ ور تھے۔ یہ خیال کیا گیا کہ ان کی مظلومیت کا سبب ان پر بے جا پابندیاں اور آزادی سے محرومی ہے، چنانچہ ان کے لیے ہر طرح کی آزادی کی وکالت کی گئی اور انہیں یہ حق دلایا گیا کہ وہ اپنی مرضی کی آپ مالک ہیں۔ کوئی، حتیٰ کہ ان کے شوہر بھی ان پر اپنی مرضی نہیں تھوپ سکتے۔ یہ خیال کیا گیا کہ ان کی مظلومیت کا سبب مالی اعتبار سے مَردوں پر ان کا انحصار ہے، چنانچہ ملازمتوں کے دروازے ان پر کھول دیے گئے اور انہیں خود کفیل بنا دیا گیا۔ حالاں کہ یہ تمام خیالات بے بنیاد اور غلط تجزیہ پر مبنی تھے۔ چنانچہ صحیح تشخیص اور صحیح علاج نہ ہونے کی بنا پر مرض میں نہ صرف یہ کہ کوئی افاقہ نہیں ہے، بلکہ اس کی شدّت اور خطرناکی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

گھریلو تشدد روکنے کے لیے اسلام کی تدابیر

گھریلو تشدد کے مسئلہ کو اسلام نے بہت خوب صورتی سے حل کیا ہے۔ اس نے خاندانی نظام کو جن خطوط پر استوار کیا ہے اور اسے صحیح طریقے پر چلانے کے لیے جو تعلیمات و ہدایات دی ہیں ان پر کما حقہٗ عمل کیا جائے تو گھر

جنت نظیر بن جاتا ہے اور ایک خاندان میں رہنے والے تمام افراد ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ کسی کو اپنی حق تلفی کا احساس ہوتا ہے نہ کسی کو دوسرے پر بے جا تشدد کرنے کا موقع ملتا ہے۔ سطور ذیل میں اسلام کی ان تعلیمات اور اقدار کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو گھریلو تشدد کو روکنے میں معاون بنتی ہیں:

(۱) مرد اور عورت رفیق ہیں نہ کہ فریق

اسلام نے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا حریف اور مدّ مقابل نہیں' بلکہ رفیق اور ہمدرد بنایا ہے' جو ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کرتے اور باہم مل جل کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ (التوبۃ: ۷۱)

''مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں' یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔''

اس نے نظامِ خاندان میں زوجین کو ایک دوسرے کے لیے باعثِ سکون قرار دیا ہے اور باہم محبت اور رحم و کرم کرنے کی تاکید کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ (الروم: ۲۱)

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں' تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔''

(۲) حقوق میں مساوات اور فطری تقسیمِ کار

اسلام نے مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات کا اعلان کیا اور زندگی کے مختلف میدانوں میں عورتوں کو مَردوں کے مساوی حقوق عطا کیے' لیکن ان کے حقوق میں مساوات کا مطلب ان کے کاموں کی یکسانیت نہیں ہے۔ اس نے دونوں کے دائرۂ کار الگ الگ رکھے اور ان کی فطری صلاحیتوں کی رعایت کرتے ہوئے منصفانہ طور پر ان کے کام تقسیم کیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرۃ: ۲۲۸)

''اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں معروف طریقے پر۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ)) (۱۲)

''مرد اپنے گھر والوں کا راعی (نگراں) ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور بچوں کی راعیہ (نگراں) ہے اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

(۳) مرد کی ذمہ داری خاندان کی حفاظت اور نگرانی

زوجین کے مساوی حقوق کی وضاحت اور فرائض کی تعیین کے ساتھ ساتھ اسلام نے مرد پر ایک اضافی ذمہ داری یہ عائد کی کہ وہ خاندان کی سربراہی کرے۔ کسی بھی ادارے کا نظم بہتر طریقے پر اسی صورت میں چل سکتا ہے جب ایک شخص کو اس کا سربراہ بنایا جائے اور دوسرے افراد پر اس کی اطاعت لازم قرار دی جائے۔ اس ذمہ داری کو قرآن میں 'قوامیت' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ﴾

(النساء: ٣٤)

''مرد عورتوں کے ''قوّام'' (سربراہ) ہیں' اس سبب سے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔''

لفظ 'قوّام'' سے کسی اعزاز' غلبہ وتسلّط اور حاکمانہ اقتدار و اختیار کا اظہار نہیں ہوتا' بلکہ حقیقت میں یہ صفت ایک انتظامی ذمہ داری کو ظاہر کرتی ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۹۷۹ء/ ۱۳۹۹ھ) نے لکھا ہے:

''قوام یا قیّم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت ونگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو''[۱۳]

(۴) عورت کو شوہر کی اطاعت کی تاکید

دوسری طرف اسلام نے عورتوں کو پابند کیا کہ وہ اپنے شوہروں کی اطاعت کریں' اور کسی معاملے میں ان کی حکم عدولی نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ﴾ (النساء: ٣٤)

''پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مَردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت ونگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔''

امام فخر الدین رازیؒ (م ٦٠٦ھ) نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''آیت کے اس ٹکڑے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ قانتات کا معنیٰ ہے اللہ کی اطاعت کرنے والیاں اور حافظاتٌ لِلغیب کا مطلب ہے شوہروں کے حقوق ادا کرنے والیاں۔ یہاں پہلے حق اللہ کی ادائی کا تذکرہ کیا گیا' بعد میں شوہر کے حقوق کی ادائی کی بات کہی گئی۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ پورے ٹکڑے میں شوہر کے حقوق کا تذکرہ ہے۔ قانتات کا مطلب یہ ہے کہ وہ شوہروں کی موجودگی میں ان کی اطاعت شعار ہوتی ہیں اور حافظاتٌ لِلغیب کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کی غیر حاضری میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں''۔[۱۴]

ذخیرۂ احادیث میں بھی ایسی بہت سی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک عورت کا وصف یہ ہے کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے اور اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔

(۵) مرد کو بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت

اسلام نے مردوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ وہ ان کی خادمائیں نہیں ہیں کہ ان کو اپنے سے کم تر سمجھیں' ان کی تحقیر و تذلیل کریں یا ان کو جسمانی یا نفسیاتی اذیتیں دیں۔ میاں بیوی دونوں الگ الگ خاندانوں سے آ کر ایک خاندان تشکیل دیتے ہیں' ان کے درمیان مزاجی فرق عین ممکن ہے' اس لیے اگر بیوی کی کوئی بات یا کوئی رویہ شوہر کو ناگوار گزرے تو اس سے نفرت نہ کرنے لگے' بلکہ اس کے ساتھ محبت' شائستگی اور ہمدردی کے ساتھ پیش آئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿١٩﴾﴾ (النساء)

''ان کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ)) (۱۵)

''کوئی صاحبِ ایمان مرد (شوہر) کسی صاحب ایمان عورت (بیوی) سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی خصلت اسے بُری لگے گی تو دوسری خصلت اس کے نزدیک پسندیدہ ہوگی۔''

متعدد احادیث میں مَردوں کو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور لطف و کرم کے ساتھ پیش آنے کی تاکید کی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا' وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ خُلُقًا)) (۱۶)

''اہل ایمان میں کامل ترین ایمان والے وہ ہیں جو اخلاق کے معاملے میں بہتر ہوں' اور تم میں بہتر وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ سب سے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کریں۔''

(۶) عورت پر تشدد نہ کرنے کے صریح احکام

اسلام نے بیویوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور ان سے نفرت نہ کرنے کی عمومی ہدایات ہی نہیں دیں' بلکہ صریح احکام کے ذریعے شوہروں کو ان پر ظلم و تشدد کرنے سے روکا ہے۔ اس مضمون کی چند احادیث ملاحظہ ہوں:

حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَجْلِدُ اَحَدُكُمُ امْرَاَتَهُ جَلْدَ الْعَبْدِ ثُمَّ يُجَامِعُهَا فِي آخِرِ الْيَوْمِ)) (۱۷)

''تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو اس طرح نہ مارے جس طرح غلام کو مارتا ہے' کیوں کہ پھر وہ دن گزرنے کے بعد اس کے ساتھ شب باشی کرے گا۔''

حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں' ایک موقع پر میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول' میری بیوی کی زبان ٹھیک نہیں' یعنی وہ بدزبان ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسے طلاق دے دو۔ میں نے

عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ کافی عرصہ میرے ساتھ گزار چکی ہے اور اس سے میرے بچے بھی ہیں۔ فرمایا: اسے سمجھاؤ بجھاؤ! اگر اس میں کچھ بھی خیر ہوگا تو وہ تمہاری مرضی کے کام کرنے لگے گی! اپنی گھر والی کو اس طرح ہرگز نہ مارو جس طرح اپنی لونڈی کو مارتے ہو (ولا تضربنّ ظعينتك ضربك أمتك) (۱۸)

ان احادیث میں بیوی کو مارنے کو ناپسندیدہ، غیر مطلوب اور قابلِ نفرت عمل کی حیثیت سے پیش کرنے کے لیے نفسیاتی تدبیر اختیار کی گئی ہے۔ شیخ رشید رضاؒ (م ۱۳۵۴ھ) نے اس مضمون کی بعض احادیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ احادیث مرد کو یاد دلاتی ہیں کہ اگر وہ جانتا ہے کہ اسے آئندہ ضرور اپنی بیوی سے ملنا اور خاص تعلق قائم کرنا ہے، وہ تعلق جو دو انسانوں کے درمیان پایا جانے والا سب سے مضبوط اور محکم تعلق ہوتا ہے اور اس کے ذریعے دونوں کے درمیان مکمل اتحاد ہو جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا تعلق دوسرے سے اس سے زیادہ قوی ہے جتنا اس کے اپنے اعضاء بدن کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ تعلق اور اتحاد واقعتاً محسوس کرتا ہے، جو فطرت کا تقاضا ہے، تو کیوں کر اس کے شایانِ شان ہے کہ وہ اپنی بیوی کو، جو اسی جیسی ہے، اتنا ذلیل اور بے حیثیت کر دے جتنا اس کا غلام ہوتا ہے کہ وہ اسے اپنے کوڑے یا ہاتھ سے مارے! واقعہ یہ ہے کہ شرمیلے اور باعزت مرد کا مزاج ایسی زیادتی کرنے سے بچے گا اور جس عورت کو وہ لونڈی کے درجے میں کر دے اس سے غیر معمولی اتحاد کا مطالبہ کرنے سے اس کی طبیعت ابا کرے گی۔ ان احادیث سے عورتوں کو مارنے کی انتہائی شناعت ظاہر ہوتی ہے''۔ (۱۹)

حضرت ایاس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر مَردوں کو تلقین فرمائی:

((لَا تَضْرِبُوْا اِمَاءَ اللّٰهِ)) ''اللہ کی باندیوں (یعنی اپنی عورتوں) کو نہ مارو''۔ اسی حدیث میں آگے ہے کہ ایک مرتبہ کئی لوگوں نے اپنی بیویوں کی پٹائی کر دی۔ اگلے دن وہ عورتیں ازواجِ مطہرات کے گھروں میں اکٹھی ہو کر اپنے شوہروں کی شکایت کرنے لگیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک شکایت پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَقَدْ طَافَ بِآلِ مُحَمَّدٍ نِسَاءٌ كَثِيْرٌ يَشْكُوْنَ اَزْوَاجَهُنَّ، لَيْسَ اُولٰئِكَ بِخِيَارِكُمْ)) (۲۰)

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کے پاس بہت سی عورتوں نے چکر لگائے ہیں اور اپنے شوہروں کی شکایت کی ہے۔ یہ لوگ تم میں سے اچھے آدمی نہیں ہیں۔''

(۷) بے جا تشدد پر شوہر کی تعزیر ہوگی

اس سے بڑھ کر اسلامی شریعت نے یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے کہ اگر کوئی مرد مذکورہ اسلامی تعلیمات کو پامال کرتا ہے اور اپنی بیوی کو ناحق ستاتا، اس کے ساتھ مار پیٹ کرتا اور اذیتیں دیتا ہے تو عورت کو حق ہے کہ وہ اسلامی عدالت سے فریاد کرے اور قاضی پر لازم ہے کہ اس کی شکایت درست پائے تو مرد کو تعزیری سزا دے۔

الموسوعة الفقهية میں ہے:

''فقہاء نے کہا ہے کہ شوہر اگر اپنی بیوی پر ظلم و زیادتی کرے تو حاکم یا قاضی اسے اس سے روکے گا۔ جمہور فقہاء نے صراحت کی ہے کہ قاضی یا حاکم اس پر شوہر کو سزا دے سکتا ہے'' (۲۱)

اگر ان تعلیمات وہدایات پر صحیح طریقہ سے عمل کیا جائے تو گھریلو تشدد کو آسانی سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ جن معاشروں میں ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ امن وسکون کا گہوارہ ہوتے ہیں اور ان میں رہنے والے تمام افراد خوشی خوشی زندگی گزارتے ہیں۔

نافرمانی اور سرکشی کی صورت میں تادیب کی اجازت ہے

اس موضوع پر گفتگو مکمل نہیں ہو سکتی جب تک یہ وضاحت نہ کر دی جائے کہ اسلام نے مذکورہ بالا تدابیر کے ساتھ ایک استثناء بھی رکھا ہے اور وہ یہ کہ نظامِ خاندان میں اگر عورت اپنے شوہر کے حکموں کی تعمیل نہ کرے اور خودسری وسرتابی کا مظاہرہ کرے تو ایسی سرکش ونافرمان عورت کی اصلاح وتادیب کے لیے شوہر کو اسے معمولی نفسیاتی یا جسمانی سزا دینے کا اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ﴿۳۴﴾﴾ (النساء)

''اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ' خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور انہیں مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو۔ یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔''

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ سرکش عورتوں کی اصلاح کے لیے ان کے شوہر تین تدابیر اختیار کر سکتے ہیں: اول انہیں سمجھائیں بجھائیں۔ دوم: ان سے خواب گاہوں میں علیحدگی اختیار کر لیں۔ سوم: انہیں ماریں۔ خواب خواہوں میں رہتے ہوئے جنسی تعلق سے کنارہ کش رہنا نفسیاتی تادیب ہے اور مارنا جسمانی تادیب۔

اسلام کی یہ تعلیم بعض ذہنوں میں الجھن پیدا کرتی ہے اور بعض حضرات اسے اسلام پر اعتراض کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس لیے اس پر کسی قدر تفصیل سے اظہار خیال کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

'نشوز' کیا ہے؟

اس آیت میں عورتوں کی اصلاح سے متعلق جن تدابیر کا تذکرہ کیا گیا ہے انہیں اس صورت میں بروئے کار لانے کی ہدایت کی گئی ہے جب ان سے ''نشوز'' کا ارتکاب ہو۔

'نشوز' کا لغوی معنیٰ ہے بلند ہونا۔ اس معنیٰ میں بلند زمین کو نشز اور نشاز کہتے ہیں:

''اصل النشوز الارتفاع ومنه قیل للمکان المرتفع من الأرض نشز ونشاز'' (۲۲)

قرآن کریم میں ''نشوز'' کا استعمال شوہر اور بیوی دونوں کے تعلق سے ہوا ہے۔ شوہر کے نشوز کا مطلب ہے بیوی پر ظلم وزیادتی (۲۳) اور بیوی کا ''نشوز'' یہ ہے کہ وہ خود کو شوہر سے بالاتر کر لے' اس کا کہنا نہ مانے' جس چیز کا شوہر حکم دے اس کے خلاف کرے اور اس سے نفرت کرے۔ جوہری (م ۳۹۳ھ) کہتے ہیں:

نشزت المرأة نشوزاً اذا استعصت علی بعلها وأبغضته (۲۴)

''عورت کے نشوز کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کا کہنا نہ مانے اور اس سے نفرت کا اظہار کرے۔''

راغب اصفہانیؒ (م۵۰۲ھ) فرماتے ہیں:

نشوز المرأة بغضها لزوجها ورفع نفسها عن طاعته (۲۵)

''عورت کے نشوز کا مطلب ہے اس کا اپنے شوہر سے نفرت کرنا اور اس کی اطاعت سے خود کو بلند سمجھنا۔''

مفسرین کرام نے بھی اس معنیٰ کی توثیق کی ہے۔ چند اقوال ملاحظہ ہوں:

قرطبیؒ (م۶۷۱ھ) فرماتے ہیں:

عصيانهن وتعاليهن عما اوجب الله عليهن من طاعة الأزواج (۲۶)

''یعنی وہ نافرمان ہو جائیں اور اللہ نے شوہروں کی جو اطاعت ان پر واجب کی ہے اس سے خود کو بلند سمجھنے لگیں۔''

ابن کثیرؒ (م۷۷۴ھ) فرماتے ہیں:

النشوز هو الارتفاع فالمرأة الناشز هي المرتفعة على زوجها التاركة لأمره المعرضة عنه المبغضة له (۲۷)

''نشوز کے لغوی معنیٰ بلند ہونے کے ہیں۔ نشوز کرنے والی عورت وہ ہے جو خود کو اپنے شوہر سے برتر سمجھے، اس کا کہنا نہ مانے، اس سے اعراض کرے اور اس سے نفرت کا اظہار کرے۔''

اردو مفسرین میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ (م۱۹۹۷ء/۱۴۱۸ھ) نے لفظ ''نشوز'' کی اچھی تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''نشوز کے معنیٰ سر اٹھانے کے ہیں، لیکن اس لفظ کا غالب استعمال اس سرتابی و سرکشی کے لیے ہوتا ہے جو کسی عورت کی طرف سے اس کے شوہر کے بالمقابل ظاہر ہو... نشوز عورت کی ہر کوتاہی، غفلت یا بے پروائی یا اپنی شخصیت اور اپنی رائے اور ذوق کے اظہار کی قدرتی خواہش کو نہیں کہتے۔ نشوز یہ ہے کہ عورت کوئی ایسا قدم اٹھاتی نظر آئے جو مرد کی قوامیت کو چیلنج کرنے والا ہو اور جس سے گھر کی مملکت میں بدامنی و اختلال پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔'' (۲۸)

عورت کا نشوز زبان سے بھی ہو سکتا ہے اور عمل سے بھی (۲۹)۔ مفسرین اور فقہاء نے ''نشوز'' کی بعض صورتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بیوی شوہر کی جنسی خواہش کی تکمیل میں تعاون کرنے سے انکار کر دے (۳۰)۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس میں شوہر کی ہر طرح کی نافرمانی شامل ہے۔ شیخ رشید رضاؒ لکھتے ہیں:

''اکثر فقہاء نے شرعی نشوز کی چند صورتیں بیان کی ہیں: مثال کے طور پر شوہر کی جنسی خواہش پوری کرنے سے انکار کر دینا، گھر سے بغیر کسی ضرورت کے نکلنا، شوہر کے کہنے کے باوجود زیب و زینت نہ اختیار کرنا، دینی فرائض سے غفلت برتنا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ 'نشوز' کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس نافرمانی پر ہوگا جس کا سبب خود کو بڑا سمجھنا اور شوہر کے حکم سے سرتابی کرنا ہو۔'' (۳۱)

مقصود تادیب ہے نہ کہ تشدد

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ مارنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے کہ عام حالات میں بیوی کی ضرور پٹائی کی جائے، بلکہ مخصوص صورت حال میں، جب اس کی سرکشی اور نافرمانی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہو، شوہر کو اجازت دی گئی

ہے کہ اگر دیگر تدابیر سے کام نہ چلے تو ناگزیر صورت میں بیوی کو بہت معمولی اور ہلکی جسمانی سزا دے سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھنے کی تاکید کی گئی ہے کہ اس جسمانی سزا کا مقصد تادیب ہے نہ کہ بیوی پر ظلم ڈھانا اور اس پر تشدد روا رکھنا۔ اسی وجہ سے اس معاملہ میں غیر معمولی احتیاط برتنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیا تو اس میں یہ بھی فرمایا:

((فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ اَخَذْتُمُوْهُنَّ بِاَمَانِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَنْ لَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ اَحَدًا تُكْرِهُوْنَهُ فَإِنْ فَعَلْنَ ذٰلِكَ فَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ)) (۳۲)

''عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تم نے انہیں اللہ کی امان میں لیا ہے اور ان کی شرم گاہیں تمہارے لیے اللہ کے کلمہ کے ذریعے حلال ہوئی ہیں۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر ایسے کسی شخص کو نہ آنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں ایسی مار مارو کہ اس کا جسم پر کوئی نشان ظاہر نہ ہو اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ انہیں دستور کے مطابق کھانا کپڑا دو۔''

امام ترمذی نے حضرت عمرو بن الاحوص رضی اللہ عنہ کے واسطے سے خطبۂ حجۃ الوداع کے جو الفاظ نقل کیے ہیں، وہ کچھ مختلف ہیں۔ ان میں ہے:

((... اِلَّا اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ فَإِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ)) (۳۳)

''.....مگر یہ کہ وہ کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور انہیں ایسی مار مارو، جس کا جسم پر کوئی نشان ظاہر نہ ہو۔''

'بَرَّحَ' کا معنی ہے سختی کرنا، تکلیف پہنچانا۔ 'ضربٌ مبرّحٌ' اس مار کو کہتے ہیں جس میں سخت چوٹ لگے۔ حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ (۳۴)

ابوحیان فرماتے ہیں:

الضرب غير المبرّح هو الذى لايهشم عظمًا ولا يتلف عضوًا ولا يعقب شينًا (۳۵)

''ضرب غیر مبرح'' سے مراد وہ مار ہے جس سے نہ کوئی ہڈی ٹوٹے، نہ کوئی عضو تلف ہو اور نہ جسم پر اس کا کوئی نشان باقی رہے۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کے شاگرد عطاؒ نے دریافت کیا 'ضرب غير مبرّح' سے مراد کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: مسواک جیسی چیز سے مارنا۔ (۳۶)

مارنے کا مقصد عورت کو ذلیل و رسوا کرنا یا اسے جسمانی اذیت پہنچانا نہیں، بلکہ اس کی اصلاح و تادیب ہے، اس لیے علماء نے صراحت کی ہے کہ شوہر مارنے میں حتی الامکان احتیاط ملحوظ رکھے۔ مثلاً چہرے پر نہ مارے، ایک ہی جگہ نہ مارے، لاٹھی ڈنڈے سے نہ مارے، بلکہ ہاتھ سے، رومال سے یا کسی اور ہلکی چیز سے مارے، جس سے جسم پر کوئی نشان نہ پڑے۔ امام رازیؒ نے مارنے میں مختلف احتیاطی تدابیر بتانے کے بعد لکھا ہے:

وبالجملة فالتخفيف مراعى فى هذا الباب على أبلغ الوجوه (۳۷)

''حاصل یہ کہ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ تخفیف ملحوظ رکھنی چاہیے۔''

اصلاحی تدابیر اختیار کرنے میں تدریج

ایک بات یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ قرآن کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ اصلاحی تدابیر میں تدریج ملحوظ رکھی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ عورت کی جانب سے سرکشی کا اظہار ہوتے ہی بیک وقت تینوں تدابیر پر عمل کر لیا جائے' یا شوہر جب جس چیز کو چاہے بروئے کار لے آئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے:

''یہ مطلب نہیں ہے کہ تینوں کام بیک وقت کر ڈالے جائیں' بلکہ مطلب یہ ہے کہ نشوز کی حالت میں ان تینوں تدبیروں کی اجازت ہے۔ اب رہا ان پر عمل درآمد تو بہرحال اس میں قصور اور سزا کے درمیان تناسب ہونا چاہیے اور جہاں ہلکی تدبیر سے اصلاح ہو سکتی ہو وہاں سخت تدبیر سے کام نہ لینا چاہیے''۔ (۳۸)

قدیم مفسّرین نے بھی مذکورہ اصلاحی تدابیر میں ترتیب کا لحاظ رکھنے کی تاکید کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر ہلکی تدبیر سے کام چل سکتا ہو تو سخت تدبیر کو نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

الذی یدل علیه انه تعالیٰ ابتدأ بالوعظ ثم ترقّی منه الی الهجران فی المضاجع' ثم ترقی منه الی الضرب' وذلك تنبیه یجری مجری التصریح فی أنه مهما حصل الغرض بالطریق الأخفّ وجب الاکتفاء به ولم یجز الإقدام علی الطریق الأشقّ۔ (۳۹)

''آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سمجھانے کا حکم دیا ہے' پھر اس سے آگے بڑھ کر بستروں میں تنہا چھوڑنے کو کہا ہے' پھر اس سے آگے بڑھ کر مارنے کا حکم دیا ہے۔ یہ ایسی تنبیہہ ہے جس سے تقریباً صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہلکے طریقے سے مقصد حاصل ہو وہاں تک اس پر اکتفا کرنا ضروری ہے' اسے چھوڑ کر سخت طریقے کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔''

ابن عطیہؒ (م ۵۴۲ھ) نے لکھا ہے:

هذه العظة والهجر والضرب مراتب۔ إن وقعت الطاعة عند إحداها لم یتعدّ الی سائرها (۴۰)

''سمجھانا' تنہا چھوڑنا اور مارنا' تینوں کاموں میں ترتیب ہے۔ کسی ایک تدبیر سے عورت اطاعت کرنے لگے تو دیگر تدابیر نہیں اختیار کی جائیں گی۔''

مفسّرین نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ مذکورہ تینوں امور کے درمیان اگرچہ حرف عطف 'وٗ' لایا گیا ہے' جو عربی قواعد کے اعتبار سے ترتیب پر دلالت نہیں کرتا' لیکن سیاق و قرینہ سے ترتیب ہی ظاہر ہوتی ہے۔ (۴۱)

مارنے کا حکم موجب قدح نہیں

اسلام پر اعتراضات کرنے والوں نے قرآن کے اس حکم کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے نزدیک یہ عورت کی انسانیت کی توہین و تذلیل ہے کہ کوئی شخص' خواہ وہ شوہر ہی کیوں نہ ہو' اسے مارے پیٹے۔ قابل غور یہ ہے کہ قرآن نے یہ حکم اس صورت میں' جب دیگر تدابیر ناکام ہو جائیں' ناگزیر علاجی تدبیر کے طور پر دیا ہے۔ اس کا یہ

حکم عام حالات میں اور عام عورتوں کے لیے نہیں ہے' بلکہ اس مخصوص صورت حال کے لیے ہے جب عورت خود سر ہو جائے' مرد سے نفرت کرنے لگے' اس کا کہنا نہ مانے اور اسے اپنے سے کم تر سمجھنے لگے۔ جن لوگوں کو قرآن کا یہ حکم عورت کی توہین وتذلیل معلوم ہوتا ہے انہیں عورت کے باغیانہ تیور اور خودسری پر مبنی رویہ میں مرد کی تحقیر و تذلیل کا پہلو نظر نہیں آتا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (م ۱۹۷۷ء/ ۱۳۹۷ھ) نے لکھا ہے:

''قرآن کا خطاب ظاہر ہے (لیکن بار بار اسے یاد کر لینے کی بھی ضرورت ہے کہ) کسی ایک طبقہ' کسی ایک قوم' کسی ایک تمدن سے نہیں' اس کے مخاطب... ہر طبقہ' ہر سطح' ہر ذہنیت کے لوگ پہلی صدی ہجری سے لے کر قیامت تک ہر زمانے اور ہر دور والے ہیں اور اس کے احکام و مسائل میں لحاظ ہر انسانی ضرورت اور ہر بشری ماحول کا کر لیا گیا ہے' چنانچہ یہ مشاہدہ ہے کہ بہت سے معاشرے اور طبقے ایسے ہیں جہاں عورت کے لیے جسمانی سزائیں عام ہیں' علاج کی یہ صورت ظاہر ہے کہ انہی طبقوں کے لیے ہے' پھر اتنی اجازت بھی ضرورت پڑنے ہی پر ہے' ورنہ سیاقِ عبارت نرمی ہی کی سفارش کر رہا ہے... قرآن مجید میں اس حکم کا ملنا قرآن مجید کے حق میں ذرا بھی مضر نہیں' جیسا کہ بعض یورپ زدہ مسلمان سمجھ رہے ہیں' بلکہ یہ تو عین دلیل ہے اس کی کہ قرآن مجید کے احکام ہر طبقہ اور ہر مزاج اور ہر سطح انسانی کے لیے ہیں''۔ (۴۲)

شیخ محمد عبدہٗ (م ۱۳۲۳ھ) فرماتے ہیں:

''عورتوں کو مارنے کی مشروعیت ایسی چیز نہیں ہے جو عقل یا فطرت کی رو سے اتنی ناپسندیدہ ہو کہ اس کی تاویل کی ضرورت محسوس کی جائے۔ اس کی ضرورت ماحول کے فساد یا فاسد اخلاق کے غلبہ کی صورت میں پڑتی ہے اور اسے اسی صورت میں مباح قرار دیا گیا ہے جب مرد محسوس کرے کہ عورت کی سرکشی اس کے بغیر ختم نہیں ہو سکتی۔ اگر ماحول درست ہو اور عورتیں نصیحت کو سمجھنے اور وعظ پر کان دھرنے لگیں یا ترکِ تعلق سے وہ سرکشی سے باز آ جائیں تو مارنے سے بچنا ضروری ہے''۔ (۴۳)

علامہ رشید رضاؒ نے لکھا ہے:

''ہمارے یہاں سرکش عورت کو مارنے کی مشروعیت پر مغربی تہذیب و معاشرت کی نقالی کرنے والے بعض حضرات ناک بھوں چڑھاتے اور ناگواری کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں اس پر کوئی ناگواری نہیں ہوتی کہ عورت مرد کی سرتابی کرے' اس پر اپنی بڑائی جتائے اور گھر کے سربراہ کو اپنا ماتحت بلکہ حقیر سمجھے' اپنی سرکشی پر مصر رہے' یہاں تک کہ نہ اس کے وعظ و نصیحت پر نرم پڑے' نہ اس کی بے رخی اور ترکِ تعلق کی کوئی پروا کرے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ لوگ ایسی سرکش عورتوں کا کیوں کر علاج کرتے ہیں اور ان کے شوہروں کو ان کے ساتھ کیسا معاملہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ شاید ان کے تصور میں ایک ایسی عورت ہوتی ہے جو نحیف و نزار' تہذیب یافتہ اور اعلیٰ اخلاق کی حامل ہے' جس پر ایک تند خو اور سنگ دل مرد ظلم ڈھاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے تر و تازہ گوشت سے اپنے کوڑے کا پیٹ بھرتا اور اس کے تازہ خون سے اسے سیراب کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس قسم کی مار مارنے کی اجازت دے رکھی ہے اور وہ اسے خواہ کتنی ہی تکلیف پہنچائے اور کیسی ہی سزا دے اس پر کوئی گناہ نہیں' جیسا کہ بہت سے سنگ دل اور درشت خو مرد کرتے ہیں۔ حاشا للہ' اللہ تعالیٰ اس ظلم کی اجازت دیتا ہے نہ اسے پسند کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے مرد تند خو اور سنگ دل ہوتے ہیں جو عورت پر خواہ مخواہ ظلم و زیادتی کرتے ہیں۔ ایسے مردوں کی تنبیہ کے

لیے بہت سی احادیث آئی ہیں اور ان کے معاملے میں قرآن کریم میں 'تحکیم' کا اصول بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ بہت سی عورتیں زبان دراز' سرکش اور بہانے باز ہوتی ہیں۔ وہ اپنے شوہروں سے نفرت کرتی ہیں' ان کے احسانات کی ناشکری کرتی ہیں' محض بغض وعناد میں ان کے حکموں کی سرتابی کرتی ہیں' انہیں ایسے کاموں پر مجبور کرتی ہیں جو ان کے بس میں نہیں ہوتے۔ روئے زمین میں کیا فساد واقع ہو جائے گا اگر کسی متقی و پرہیزگار مرد کو اجازت دے دی جائے کہ وہ کسی ایسی عورت کے ہاتھ پر ایک مسواک مار کر یا اس کی گردن پر ایک چپت رسید کر کے اس کے بغض میں کچھ کمی کر دے یا اس کی سرکشی و غرور کا پارہ کچھ اتار دے؟! اگر اس چیز کا جواز ان کے مزاجوں پر گراں گزرتا ہے تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے مزاجوں میں فساد آ گیا ہے اور انہیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ان کے بہت سے انگریز دانش ور پڑھی لکھی' تہذیب یافتہ' لباس پہننے کے باوجود عریاں نظر آنے والی' دوسروں کی طرف مائل ہونے والی اور دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی عورتوں کو مارتے رہے ہیں۔ ایسا ان کے دانش وروں نے بھی کیا ہے اور مذہبی لوگوں نے بھی' ان کے حکمرانوں نے بھی کیا ہے اور ان کے سربرآوردہ طبقہ کے لوگوں نے بھی۔ یہ ایسی ضرورت ہے جس سے ان تعلیم یافتہ عورتوں کی عزت افزائی میں غلو کرنے والے بے نیاز نہیں ہیں تو ایک ایسے مذہب میں اس کی ضرورت اور اس کے مباح ہونے پر ناگواری کا کیوں کر اظہار کیا جا سکتا ہے جو بدوی اور متمدن' انسانوں کے تمام طبقات کے لیے عام ہے''۔ (۴۴)

☆☆☆

حواشی ومراجع

(1) http://www.usdoj.gov/ovw/domviolence.htm

(2) http://www.cafcass.gov.uk/English/publications/ consultations/ 04 Dcc DV%20 policy.pdf

(3) Foreword on WHO Multi-Country study on women's health and domestic violence against women

(5) National violance against women survay (2000) available at http://www.ojp.usdoj.gov/nij/pubs-sum/183781.htm

(6) US Deptt. of Justice NCJ 207846, Bureau of Justice statisties, Family Violence Statistics: including statistics on strangers and Acquaintance, at 31-32 (2005) available at: http://www.ojp.usdoj.gov/bjs/pub/pdf/fvs.pdf

(7) Women's Aid Federation [England] Report, 1992

(8) Domestic Violence-Action for Change, G.H- ague & E. Malos 1993

(9) Crime in England and Wales, 2006/2007 report

(۱۰) اس قانون کے غلط استعمال سے مردوں کی ایک بڑی تعداد پریشان ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شوہروں کے حقوق کی حفاظت کرنے اور انہیں گھریلو تشدد سے بچانے کے لیے بعض تحریکات' جن میں Save Faimly Foundation اور My Nation قابلِ ذکر ہیں' سرگرم ہوگئی ہیں۔ شوہروں

کے خلاف تشدد کے موضوع پر ایک سروے بھی کرایا گیا ہے جس سے کھل کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ۲۰ سے ۳۲ فی صد شوہر اپنی بیویوں کی جانب سے ہر طرح کے تشدد کا شکار ہیں۔ اس سروے کی تفصیلات کے لیے رجوع کیجیے:
http://498a.wordpress.com, http://victims-of-law.blogspot.com
(11) UN Report, 13th Oct.2009 (Press Trust of India)

(۱۲) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب قول اللّٰہ اطیعوا اللّٰہ' ۷۱۳۷' و دیگر مقامات۔ صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' ۱۸۲۹

(۱۳) مولانا سید ابوالاعلی مودودی' تفہیم القرآن' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز' نئی دہلی ۲۰۰۰ء' ۱/ ۳۴۹۔ اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم کا مقالہ ''مرد کی قوامیت - مفہوم اور ذمہ داریاں'' شائع شدہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی' علی گڑھ' اکتوبر - دسمبر ۲۰۰۹ء

(۱۴) فخرالدین الرازی' مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر' تحقیق: عماد زکی البارودی' المکتبة التوفیقیة القاهرة مصر' ۱۰/ ۸۰

(۱۵) صحیح مسلم' کتاب الرضاع' باب الوصیة بالنسا' ۱۴۶۹

(۱۶) جامع الترمذی' ابواب الرضاع' باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها' ۱۱۶۲

(۱۷) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب مایکره من ضرب النساء' ۵۲۰۴' صحیح مسلم' کتاب الجنة' ۲۸۵۵

(۱۸) سنن ابی داؤد' کتاب الطهارة' باب فی الاستنثار' ۱۴۲

(۱۹) السید محمد رشید رضا' تفسیر المنار' مطبعة المنار' مصر' ۱۳۲۸ھ' ۵/ ۷۵-۷۶

(۲۰) سنن ابی داؤد' کتاب النکاح' باب فی ضرب النساء' ۲۱۴۶۔ سنن ابن ماجه' کتاب النکاح' باب ضرب النساء' ۱۹۸۵۔ سنن الدارمی' کتاب النکاح' باب فی النهی عن ضرب النساء' ۲۲۱۹

(۲۱) الموسوعة الفقهیة' وزارة الاوقاف والشئون الاسلامیة، کویت' ۲۰۰۱ء' ۴۰/ ۳۰۵-۳۰۶

(۲۲) ابوجعفر محمد بن جریر الطبری' جامع البیان عن تاویل آی القرآن المعروف بتفسیر الطبری' تحقیق محمود محمد شاکر' احمد محمد شاکر' دار المعارف مصر' ۸/ ۲۹۹' مزید ملاحظہ کیجیے ابن منظور' لسان العرب' دار صادر بیروت' ۵/ ۴۱۸' مجدالدین الفیروز آبادی' القاموس المحیط' دار الفکر بیروت' ۱۹۹۵ء' ص ۴۷۴' ابن درید الازدی' جمهرة اللغة' دائرة المعارف العثمانیه' حیدرآباد' ۱۳۴۵ھ' ۳/ ۲' رازی' ۱۰/ ۸۲' ابوعبداللہ القرطبی' الجامع لاحکام القرآن' الهیئة المصریة العامة للکتاب' ۱۹۸۷ء' ۵/ ۱۷۰' علاؤ الدین علی بن محمد الخازن' لباب التاویل فی معانی التنزیل المعروف بتفسیر الخازن' مطبعة التقدم العلمیه مصر' ۱/ ۴۳۳' ابن تیمیه' فتاوی شیخ الاسلام' طبع سعودی عرب' ۱۴/ ۲۱۱

(۲۳) نشز بعلها علیها اذا ضربها وجفاها۔ ابونصر اسماعیل بن حماد الجوهری' تاج اللغة وصحاح العربیة' مطبع و سنه طباعت درج نهیں (طبع قدیم) ۱/ ۴۳۸

(۲۴) الجوهری' ۱/ ۴۳۸' مزید ملاحظه کیجیے فیروز آبادی / ۴۷۴

(۲۵)ابوالقاسم الحسین بن محمد بن الفضل الراغب الاصفہانی'المفردات فی غریب القرآن'تحقیق و ضبط: محمد سید کیلانی'دارالمعرفة بیروت'۴۹۵

(۲۶)قرطبی'۵/۱۷۰–۱۷۱

(۲۷)عماد الدین اسماعیل ابن کثیر'تفسیر القرآن العظیم'دارالاشاعت دیوبند'۲۰۰۲ء'۱/۶۴۲

(۲۸)امین احسن اصلاحی'تدبر قرآن'تاج کمپنی دہلی'۱۹۸۹ء'۲/۲۹۲–۲۹۳

(۲۹)رازی'۱۰/۸۲'خازن'۱/۴۳۳'بقاعی نے اس قول کو امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے برہان الدین ابراہیم بن عمر البقاعی'نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور'دائرة المعارف العثمانیة حیدرآباد'۱۹۷۲ء'۵/۲۷۱

(۳۰)وقیل منعها نفسها من الاستمتاع بها اذا طلبها لذلك'ابوحیان'۳/۳۴۰

(۳۱)رشید رضا'۵/۷۶

(۳۲)صحیح مسلم'کتاب الحج'باب حجة النبیﷺ'۱۲۱۸

(۳۳)جامع الترمذی' ابواب الرضاع'باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها'۱۱۶۳'ابواب تفسیر القرآن'سورۂ توبہ'۳۰۸۷'حسّنه الالبانی

(۳۴)ابن الاثیر الجزری'النہایة فی غریب الحدیث والاثر'المطبعة العثمانیة مصر'۱۳۱۱ھ'۱/۷۰

(۳۵)ابوحیان'۳/۳۴۱

(۳۶)طبری'۸/۳۱۴

(۳۷)رازی'۱۰/۸۳

(۳۸)مودودی'۱/۳۵۰

(۳۹)رازی'۱۰/۸۳

(۴۰)ابن عطیہ'المحرر الوجیز'۲۰/۴۸'بحوالہ ابوحیان'۳/۳۴۲

(۴۱)رازی'۱۰/۸۳'ابن المنیر الاسکندری'الانصاف فیما تضمّنه الکشاف من الاعتزال'برحاشیہ الکشاف'۱/۵۲۴'رشید رضا'۵/۷۶–۷۷

(۴۲)عبدالماجد دریابادی'تفسیر ماجدی'مجلسِ تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ'۲۰۰۸ء'طبع چہارم'۱/۷۳۳۔ مولانا نے اپنی انگریزی تفسیر میں معتبر حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ یورپ کے تمام ممالک اور تمام طبقات میں بیویوں کی مار پیٹ کا دستور رہا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: Holy Quran, Translation and Commentary, by M.Abdul Majid Daryabadi, Lucknow, 1981, vol:1, pp.327-328

(۴۳) رشید رضا'۵/۷۵

(۴۴)ایضاً'۵/۷۴–۷۵

☆☆☆

شریعتِ اسلامی میں شراب نوشی کی سزا

حافظ نذیر احمد ہاشمی

اسلام میں دنیوی سزائیں عموماً دو قسم کی متصور ہوتی ہیں: ''حد'' اور ''تعزیر''۔ فقہ اسلامی میں ان دونوں قسموں کی سزاؤں کی الگ الگ تعریفات اور تعلیقات ہیں۔ شراب نوشی حد ہے یا تعزیر' اس بارے میں علماء کے ہاں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں حدود و تعزیرات کی فنی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ شراب نوشی کی حرمت حداً ہے یا تعزیراً۔

حد کا لغوی مفہوم

(۱) دو چیزوں کے درمیان کی روک جو ایک کو دوسری سے ملنے نہ دے۔ الفصل بین الشیئین لئلا یختلط احدھما بالآخر۔

(۲) کسی شے کی انتہا' مثلاً زمینوں کی حد۔ منتھی کل شیءٍ حدہ ومنہ حدود الارضین وحدود الحرم وفی الحدیث فی صفة القرآن : ((لکل حرفٍ حدٌّ ولکل حدٍ مطلع))

(۳) حد بندی کرنا۔ دو چیزوں کے درمیان فصل' ان میں سے ہر ایک کی انتہا اس کی حد ہے۔ وحدّ الشیء من غیرہ یحدُّہٗ حدًّا وحدَّدہٗ: مَیَّزَہ وحدّ کل شیء منتھاہ لانہ یردّہ ویمنعہ من التمادی [1]

علامہ شوکانی نے لکھا ہے:

الحد لغة المنع ومنه سمی البواب حداداً وسمیت عقوبات المعاصی حدوداً لانها تمنع العاصی من العود الی تلك المعصیة التی حدّ لاجلها فی الغالب واصل الحد الشیء الحاجز بین الشیئین ویقال علی ما مَیّزَ الشیء عن غیرہ ومنه حدود الدار والارض ویطلق الحد ایضا علی نفس المعصیة ۔ ومنه ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ [2]

''حد کا لغوی معنی روکنا ہے' اس لیے دربان کو حداد کہا جاتا ہے اور مختلف گناہوں پر ملنے والی سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے' کیونکہ کسی گناہ پر لگنے والی حد اس گناہگار کو دوبارہ اس گناہ کی طرف جانے سے بالعموم روک دیتی ہے۔ حد کا اصل معنی دو چیزوں کے درمیان حائل شے ہے اور ہر اس شے کو بھی حد کہا جاتا ہے جو کسی شے کو دوسری سے علیحدہ کر دے' چنانچہ کہا جاتا ہے حدود الدار والارض (گھر اور زمین کی حدود)۔ نیز حد کا اطلاق نفسِ معصیت پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾۔''

امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے:

''الحد : دو چیزوں کے درمیان ایسی روک جوان کو باہم ملنے سے روک دے۔ حددتُ کذا میں نے فلاں چیز کے لیے حدِ ممیز مقرر کر دی۔ حدُّ الدار مکان کی حد جس کی وجہ سے وہ دوسرے مکان سے ممیز ہوتا ہے۔ حدّ الشیء کسی چیز کا وہ وصف جو دوسروں سے اس کو ممتاز کر دے اور زنا و شراب کی سزا کو حد اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا دوبارہ ارتکاب کرنے سے انسان کو روکتی ہے اور دوسروں کو بھی اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے سے روک دیتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (البقرۃ) نیز ارشاد ہے: ﴿اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (التوبۃ:۹۷)

بعض نے مندرجہ بالا آیت کریمہ میں مذکور لفظ حدود کے معنی احکام کے کیے ہیں اور بعض نے اس سے حقائق و معانی مراد لیے ہیں۔[۳]

حد کا اصطلاحی مفہوم

حنفیہ کے نزدیک حد کی تعریف یہ ہے: عقوبة مقدرة واجبة حقًّا للّٰه تعالیٰ[۴] ''وہ سزا جو متعین اور واجب ہو اللہ تعالیٰ کے حق کی پامالی کی وجہ سے''۔ حد کی یہ تعریف تعزیری سزا کو شامل نہیں' کیونکہ تعزیری سزا متعین نہیں ہوتی' بلکہ امامِ وقت کی صوابدید پر ہوتی ہے' چاہے تو ضرب کی صورت میں وہ سزا نافذ کرے یا حبس کی صورت میں۔ نیز حد کی تعریف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احناف کے نزدیک قصاص پر بھی حد کا اطلاق نہیں ہوتا' کیونکہ قصاص میں سزا کا تعین تو اگرچہ ہوتا ہے لیکن وہ حقًّا للعبد واجب ہوتا ہے حتیٰ کہ اولیاءِ مقتول کی طرف سے معافی اور صلح کی صورت میں معاف ہو جاتا ہے۔ حقًّا للّٰہ تعالیٰ کا مطلب یہ ہے کہ ان سزاؤں کی مشروعیت جان' عقل' نسل اور مال کی حفاظت کے لیے ہوئی ہے۔

حنفیہ کی نظر میں حدود پانچ ہیں: حدِ سرقہ' حدِ زنا' حدِ شُرب' حدِ سکر اور حدِ قذف' جبکہ قطع الطریق (حدِ حرابہ) کو وہ سرقہ کے مفہوم میں داخل کرتے ہیں۔

جمہور فقہاء کے نزدیک حد کی تعریف

عقوبة مقدرة شرعا سواء كانت حقًّا للّٰه تعالیٰ أم للعبد[۵]

''وہ سزا جو شرعاً مقدر ہو (مقدار مقرر کی گئی ہو) چاہے حقوق اللہ کی پامالی کی وجہ سے یا حقوق العباد کی وجہ سے۔''

تعریف میں اختلاف کی بنا پر جمہور فقہاء کے نزدیک حدود کی فہرست بھی احناف کی نسبت طویل ہے جو درج ذیل ہے: حد سرقہ' حد زنا' حد شرب' حد سکر' حد قذف' حد القصاص' حد الردۃ۔

اسلام میں دنیوی سزاؤں کی دو قسمیں ہیں: حدود۔ تعزیرات۔

حدود: وہ سزائیں جن کی نوعیت اور مقدار نصوصِ صریحہ میں از روئے شارع متعین ہو۔ یہ سزائیں محدود ہیں اور حنفیہ کی رائے میں اس کی پانچ قسمیں ہیں: (۱) حد زنا (۲) حد قذف (۳) حد سرقہ (حد حرابہ بھی اس میں شامل ہے (۴) حدّ شُرب الخمر (۵) حدّ السُّکر۔ حنفیہ نے حدود کو صرف ان ہی سزاؤں تک محدود مانا ہے کہ جن کے پیشِ نظر حقوق اللہ کی رعایت ہے' اس لیے انہوں نے قصاص کو حدود کی فہرست سے خارج کیا ہے' کیونکہ اس

میں حقوق العباد کی رعایت پیش نظر ہے۔ جبکہ حنفیہ کے علاوہ جمہور علماء کے نزدیک حدود سات ہیں: (۱) حدزنا (۲) حدقذف (۳) حدسرقہ (۴) حدحرابہ (۵) حدالمسکرات (۶) حدالقصاص (۷) حدالردّۃ۔

حد کی تعریف میں اختلاف کی وجہ سے حدود کی فہرست میں بھی اختلاف ہے۔

شافعیہ کے نزدیک حد کو واجب کرنے والے جرائم سات ہیں: (۱) جنایت علی النفس اوعلیٰ ما دونھا (۲) بغاوت (۳) ردّۃ (۴) زنا (۵) قذف (۶) سرقہ (۷) اشربہ محرمہ۔

حنفیہ کے نزدیک پانچ ہیں: (۱) زنا (۲) سرقہ، قطع الطریق (۳) قذف (۴) شرب الخمر (۵) شرب السکر۔

مالکیہ کے نزدیک جرائم موجبہ للحد آٹھ ہیں: (۱) جنایت علی النفس اوعلی ما دونھا (۲) بغاوت (۳) ردۃ (۴) زنا (۵) قذف (۶) سرقہ (۷) حرابہ (۸) شرب الخمر والمسکر۔

تعزیر: دوسری دنیوی سزا تعزیر ہے۔ عبدالرحمٰن الجزیری نے تعزیر کی مندرجہ ذیل تعریف کی ہے:

تأديب على ذنب لا حدّ فيه ولا كفّارة[6] ''ایسے گناہ پر سزا دینا جس میں نہ حد ہو اور نہ کفارہ۔''

''ایسے گناہ پر سزا دینا جس میں نہ حد ہو اور نہ کفارہ۔''

تعزیر کا لغوی معنی منع کرنا، باز رکھنا اور ملامت کرنا کے ہیں۔ یعنی تنبیہ اور تأدیب کر کے کسی کو احکام پر قائم رکھنا (**التوقيف على الفرائض والاحكام**) —— شریعت میں یہ وہ سزا اور تادیب ہے جو اس جرم پر دی جاتی ہے جس کے لیے حد متعین نہیں۔ یہ عام طور پر حد سے کم تر ہوتی ہے اور اس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ مجرم کو دوبارہ ارتکابِ معصیت و گناہ سے باز رکھا جائے (**ان يمنع الجاني ان يعاود والذنب**)

تعزیر اور تادیب میں یہ فرق ہے کہ تعزیر کے متعلق امیر المؤمنین یا حاکم وقت یعنی فقط حکومت قانون سازی کر سکتی ہے اور بعد ازاں حاکم وقت یا اس کا نمائندہ (قاضی) نوعیتِ جرم متعین کرنے کے بعد مناسب عقوبت (سزا) نافذ کرتا ہے۔ جبکہ تادیب کوئی قانونی سزا نہیں ہوتی، مثلاً استاد کا اپنے شاگرد کو یا باپ کا اپنے بیٹے کو کوئی سزا دینا تادیب ہے۔

شریعتِ اسلامیہ میں سزا تین طرح پر ہوتی ہے:

(۱) وہ سزا جسے اللہ تعالیٰ نے متعین تو کر دیا ہے لیکن اس کا نفاذ بندے پر چھوڑ دیا ہے، بالفاظِ دیگر کوئی خارجی قوت، حاکم یا حکومت اس میں دخل انداز نہیں ہوتی۔ گویا بندے کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنا تعلق خود احکم الحاکمین سے استوار کرے۔ اس قسم کی سزا کو کفارہ کہا جاتا ہے۔

(۲) وہ سزائیں جنہیں حاکم، قاضی وغیرہ یعنی حکومت نافذ کرتی ہے۔ یہ پھر دو قسم کی ہیں:

(ا) وہ سزائیں جو کتاب اللہ اور سنت نبویہ سے ثابت اور متعین ہیں، ان سزاؤں میں حاکم یا قاضی کی رائے کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ایسی سزاؤں کو حد کہا جاتا ہے، مثلاً حد سرقہ، حد قذف اور حد زنا وغیرہ۔

(ب) وہ سزائیں جنہیں کتاب وسنت نے متعین نہیں کیا ہے بلکہ حاکم وقت یا اس کا نمائندہ قاضی وغیرہ موقع کے اعتبار سے یا ضرورت کے مطابق متعین کرتا ہے۔ اس قسم کی سزاؤں میں حکومت وقت کو قانون سازی کا حق حاصل ہے۔ ان سزاؤں کو تعزیر کہا جاتا ہے۔

حد اور تعزیر میں ایک اور فرق بھی کیا جاتا ہے کہ حد حق اللہ شمار ہوتی ہے اور جبکہ تعزیر حق العبد۔ چنانچہ حد میں بندہ تصرف نہیں کرسکتا جبکہ تعزیر میں بندہ دو طرح کا تصرف کرسکتا ہے۔ ایک تو سزا کم و بیش ہوسکتی ہے اور اس کی نوعیت بھی بدلی جاسکتی ہے' مثلاً دُرّوں کی تعداد یا حبس وغیرہ باعتبار موقع و شخصیت مجرم وغیرہ۔ دوسرے تعزیر چونکہ حق العبد ہے لہٰذا مظلوم کو مجرم کو معاف کرنے کا حق ہے اور اس کے معاف کرنے سے مجرم سزا سے بری ہوسکتا ہے۔ اس اصول کے تحت قصاص کا شمار بھی حد کی فہرست میں نہیں ہوتا' کیونکہ اولیاءِ مقتول کو معافی کا اختیار ہے۔

شریعت اسلامی میں عقوبت کا اوّلین مقصد بندگانِ خدا کو مجرم کی شرارتوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن الہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے: ''**الانزجار عما یتضرر به العباد**''(۷) کیونکہ اسلام فساد فی الارض اور معاشرۂ اسلامی میں فتنے کو انتہائی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

دوسرا مقصد' انسان کی اپنی اصلاح ہے تاکہ اس کا میلانِ جرم راسخ نہ ہوجائے۔ بقول صاحب فتح القدیر ''**کی لا تصیر ملکاتٍ فیفحش ویستدرج الی ما ھو اقبح**'(۸) جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے اس مقصد میں مسلم و غیر مسلم دونوں شریک ہیں' لیکن شرعی عقوبت سے مسلمان کی عاقبت بھی درست ہوجاتی ہے' کیونکہ اس سے تطہیر عن الذنب ہوجاتی ہے اور روزِ آخرت اس کے متعلق اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔ اسی لیے تو آغازِ اسلام میں مجرم خود آکر جرم کا اعتراف کرکے سزا کا مطالبہ کرتا تھا۔

تیسرا مقصد یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں موجود انتقامی جذبہ کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے' لیکن اس انتقامی جذبے کو عفو میں تبدیل کرکے اسلام نے مکارمِ اخلاق کی طرف بڑا قدم اٹھایا ہے۔

الحاصل: اسلامی عقوبات میں وہ تینوں اغراض و مقاصد پیش نظر ہیں جنہیں علم الاخلاق تسلیم کرتا ہے۔ انتقامی' امتناعی اور اصلاحی یہ تینوں مقاصد اس کے پیش نظر ہیں۔

امام قرافی مالکی نے حد اور تعزیر میں دس وجوہ سے فرق بیان کیا ہے:

(۱) حدود و قصاص کی سزائیں شرعاً متعین ہیں' مجرم اور جرم کے حالات کی بنا پر قاضی اس میں کوئی ردّوبدل نہیں کرسکتا' جبکہ تعزیری سزاؤں کا معاملہ قاضی / حاکم کی صوابدید پر ہے جو جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات اور سزا سے اس کی اثر پذیری کی بنا پر مختلف سزائیں دے سکتا ہے۔ یہ خیال رہے کہ تعزیری سزاؤں کی تعیین میں قاضی کا یہ اختیار کچھ قواعد و ضوابط سے مشروط ہے' جن میں سے اہم اس کا عدالت و تقویٰ سے متصف ہونا بلکہ مالکیہ' شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک مرتبہ اجتہاد پر فائز ہونا بھی ہے۔ نیز مختلف تعزیری سزاؤں میں سے جرم کے مناسب سزا کا اختیار کرنا بھی اس پر لازم ہے۔

(۲) حدود اور قصاص (اولیاءِ مقتول کی طرف سے عدمِ معافی کی صورت میں) کا نفاذ سربراہِ مملکت پر واجب ہے' اس میں کسی بھی سبب کی بنا پر نہ عفو ہے' نہ سفارش' نہ ابراء ہے اور نہ اسقاط۔ جبکہ تعزیر کے بارے میں ائمہ ثلاثہ ابوحنیفہ' مالک اور احمد رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر وہ لحق اللہ تعالیٰ ہو تو حدود کی طرح اس کا نفاذ بھی واجب ہے' سوائے اس صورت کے کہ اگر امامِ وقت کو یہ ظنِ غالب ہوجائے کہ مجرم کو جرم سے باز رکھنے کے لیے بجائے مار پیٹ کے زبانی ڈانٹ ڈپٹ بھی کافی ہے تو اس کو از خود معاف کرنے کا یا سفارش قبول

کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اور اگر وہ لحق العباد ہو تو صاحبِ حق کو معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے اور اس کے معاف کیے بغیر ولی امر کے لیے اس کو معاف کرنے کا یا کسی دوسرے کی سفارش پر تعزیر کا ساقط کرنا جائز نہیں۔ امام شافعی کے نزدیک امام وقت پر تعزیر قائم کرنا واجب نہیں بلکہ قائم کرنا اور معاف کرنا دونوں کا اختیار ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ تعزیر شرعاً غیر مقدر ہے' لہٰذا اس کا نفاذ واجب نہیں ہے۔ لیکن ان کا یہ استدلال محل نظر ہے' کیونکہ اگر ان کا یہ استدلال صحیح تسلیم کیا جائے تو زوجات اور اقارب کا نفقہ (جو غیر مقدر ہے) بھی واجب نہیں ہونا چاہیے' حالانکہ امام موصوف بھی اس کے قائل ہیں۔

(۳) جرم کی جسامت کے اختلاف سے حدود میں اختلاف نہیں ہوتا' چنانچہ قلیل وکثیر کے سرقہ میں' قطرہ اور گھڑا بھر شراب نوشی میں' اسی طرح عالم' متقی اور صالح آدمی اور ایک عام آدمی کے قتل کرنے کی سزا میں کوئی فرق نہیں۔ جبکہ جرم کے اختلاف سے تعزیری سزا میں اختلاف ہو سکتا ہے۔

(٤) حدود لازمی طور پر معصیت کے نتیجے میں لاگو ہوں گی جبکہ تعزیر کے لیے یہ شرط نہیں کیونکہ تعزیر تادیب ہے' مثلاً ادب سکھانے کی غرض سے بچے کو مارنا۔

(۵) تعزیر ثابت ہونے کے بعد ساقط ہو سکتی ہے' مثلاً اگر مجرم بچہ ہے یا جرم سرزد تو ہوا ہے کسی مکلف سے لیکن وہ جرم اتنا حقیر ہے کہ جس پر سزا دینے سے مقصود حاصل نہیں ہوتا' کیونکہ خفیف سزا اس کے لیے رادع نہیں بنتی ہے اور شدید سزا دینا اس حقیر جرم پر واجب نہیں' جبکہ حد کسی صورت میں ساقط نہیں ہو سکتی۔

(٦) تعزیری سزا توبہ سے ساقط ہو سکتی ہے جبکہ ''حد'' جمہور علماء کے نزدیک' سوائے حنابلہ کے' توبہ سے ساقط نہیں ہوتی' سوائے حدِ حرابہ کے۔

(۷) تعزیر میں قاضی کو مختلف سزائیں دینے کا اختیار ہے' جبکہ حدود میں صرف ایک متعین شدہ سزا ہی دی جا سکتی ہے' سوائے حدِ حرابہ کے۔

(۸) فاعل' مفعول اور جرم کے اختلاف سے تعزیر مختلف ہو سکتی ہے' یعنی تعزیری سزا میں مقدارِ جرم' مجرم اور جو جرم کا نشانہ بنا ہے' کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔ جبکہ حدود میں یہ اختلاف نہیں' ان پر حالات اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ مذکورہ فرق دراصل فرق اول کی مکمِّل (تکمیل کرنے والی) ہے۔

(۹) علاقوں' شہروں اور زمانوں کے اختلاف سے تعزیر مختلف ہو سکتی ہے مگر حدود یکساں رہتی ہیں۔

(۱۰) تعزیر کبھی حقًّا لِلّٰہ ہوتی ہے مثلاً حرماتِ دینیہ کی بے حرمتی' قرآن پاک اور صحابہ کرام ؓ کی توہین وتنقیص وغیرہ' اور کبھی حقًّا للعَبد ہوتی ہے مثلاً کسی کو گالی گلوچ کرنے یا مار پیٹ کرنے پر' جبکہ ''حدود'' بالاتفاق حقًّا لِلّٰہ ہی ہوتی ہیں سوائے حدِ قذف کے''۔ (۹)

ان مذکورہ بالا فروق کے علاوہ حد اور تعزیر میں امام شافعی کے نزدیک ایک اور فرق بھی ہے کہ دورانِ حد اگر مجرم کی جان چلی جائے تو اس کا خون ہدر ہے' جبکہ دورانِ تعزیر جان جانے پر ضمان واجب ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام احمد بن حنبل ؒ کے نزدیک حد اور تعزیر دونوں کے دوران تلف ہو جانے والی جان کا خون ہدر ہے' کیونکہ امام کو حد اور تعزیر لگانے کا حکم ہے اور مامور کا فعل **لا یتقید بشرط السلامة** (۱۰)

حُرمتِ خَمر

شراب کی حرمت غزوۂ اُحد (۳ھ) کے بعد ہوئی ہے۔ بقول قتادہ غزوۂ احزاب کے بعد ہوئی ہے اور غزوۂ احزاب ۴ھ یا ۵ھ میں ہوا ہے۔ بقول ابن اسحاق غزوۂ بنی نضیر کے بعد ہوئی ہے' جو راجح قول کے مطابق ۴ھ میں ہوا ہے۔ دمیاطی نے اپنی سیرت میں لکھا ہے کہ شراب کی حرمت ۶ھ میں حدیبیہ کے سال ہوئی ہے۔ لیکن ابن اسحاق کا قول محل نظر ہے' جیسا کہ علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ شراب کی حرمت کے نزول والے سال حضرت انس' ابوعبیدہ' ابوطلحہ اور اُبی بن کعب رضی اللہ عنہم کو شراب پلا رہے تھے کہ اتنے میں شراب کی حرمت کی منادی کی گئی۔ اگر یہ واقعہ ۴ھ میں تسلیم کیا جائے تو اس وقت حضرت انسؓ کے صغیر السن ہونے کی وجہ سے ساقی کے فرائض انجام دینے کی بات سمجھ نہیں آتی۔ اس کی حرمت کے بارے میں مفسرین کے اقوال کا خلاصہ درج ذیل ہے:

شراب کے بارے میں قرآن مجید کی چار آیات کریمہ نازل ہوئی ہیں:

(۱) سورۃ النحل کی آیت ۶۷ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی:

﴿وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ﴾

''اور کھجور وانگوروں کے میووں سے تم بناتے ہو نشہ اور عمدہ رزق۔''

مندرجہ بالا آیت کریمہ کے نزول کے بعد بھی مسلمان شراب پیتے رہے' کیونکہ وہ اس زمانہ میں ان کے لیے حلال تھی۔ پھر جب سیدنا عمر بن الخطاب' معاذ بن جبل اور چند انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر درخواست کی: یارسول اللہ ﷺ شراب کے بارے میں ہمیں کوئی فتویٰ دیجیے' کیونکہ یہ عقل اور مال کو برباد کرنے والی ہے' تب اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۹ نازل کی: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز﴾ ''یہ لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں' آپ فرما دیجیے ان میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں''۔ اس پر بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ''اِثْمٌ كَبِيْرٌ'' فرمانے کی وجہ سے شراب چھوڑ دی اور بعض ''وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ'' کو دلیل سمجھ کر پیتے رہے۔

ایک دن ایک جلیل القدر صحابی نے اپنے دوستوں کے لیے دعوت کا اہتمام کیا' کھانے کے بعد شراب کا دور چلا' جس کی وجہ سے نشہ چڑھ گیا۔ اتنے میں مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔ امام صاحب نے نماز میں قراءت کرتے ہوئے ''قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ'' پڑھا اور آخر تک بغیر ''لَا'' کے پڑھتے چلے گئے۔ تب سورۃ النساء کی آیت ۴۳ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ نازل ہوئی۔ اس آیت کے نزول کے بعد بعض لوگوں نے تو شراب بالکل چھوڑ دی جبکہ کچھ لوگ اوقاتِ نماز کے علاوہ پیتے رہے۔ کوئی عشاء کی نماز کے بعد پی لیتا تو صبح تک اس کا نشہ اُتر جاتا اور کوئی صبح کی نماز کے بعد پی لیتا تو ظہر تک اس کا نشہ اُتر جاتا۔

ایک دن ایک اور صحابی نے دوستوں کو کھانے پر بلایا جن میں ایک جلیل القدر صحابی بھی تھے۔ کھانے کے

بعد شراب کا دور چلا اور جب نشہ چڑھ گیا تو نشہ کی حالت میں بڑائیاں مارنے اور اشعار پڑھنے لگے۔ ایک صحابی نے وہیں ایک قصیدہ پڑھا جس میں انصار کی ہجو اور ان کی قوم کی بڑائی تھی۔ انصار میں سے ایک شخص نے اُٹھ کر اونٹ کا جبڑا قصیدہ پڑھنے والے کے سر میں مارا جس سے ان کا سر پھٹ گیا۔ اُنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اس انصاری کی شکایت کی۔ تب آنحضرت ﷺ نے یہ دعا کی: ''ربّ العزت! ہمارے لیے شراب کا حکم صاف صاف بیان فرما دے''۔

آپ ﷺ کی دعا کو بارگاہ الٰہی میں سند قبولیت عطا کرتے ہوئے سورۃ المائدۃ کی آیات ۹۰'۹۱ نازل ہوئیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝۹۱﴾

آیت کریمہ کے نزول کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ پکار اٹھے: ''انتهينا انتهينا يا رب''

مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ شراب کی حرمت تدریجاً ہوئی ہے' کیونکہ ایک تو یہ عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی' دوسرے شراب ان کی تجارت اور کسب و کمائی کا ایک اہم عنصر تھا۔ چنانچہ ملک شام سے سستے داموں خرید کر مہنگے اور منہ مانگے داموں فروخت کیا کرتے تھے اور یہی ''مَنَافِعُ لِلنَّاسِ'' کی تفسیر بیان کی گئی ہے' جبکہ علامہ قرطبی نے تفسیر قرطبی میں ''مَنَافِعُ لِلنَّاسِ'' کی تفسیر میں بعض دیگر چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: شراب کھانا ہضم کرتی اور کمزوری کو قوت میں بدلتی ہے' نیز بخیل کو سخی' بزدل کو دلیر کرتی اور رنگ کو نکھارتی ہے' وغیر ذلک(۱۱)

چنانچہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

ونشربها فتترکنا ملوکًا واُسدًا ما ينهنهنا اللقاء

''شراب پینے کے بعد ہم بادشاہ اور شیر بن جاتے ہیں اور پھر جنگ کو خاطر میں نہیں لاتے۔''

ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

فاذا شربتُ فانني ربّ الخورنق والسدير

واذا صحوتُ فانني ربّ الشويهة والبعير

''شراب نوشی کے بعد میں اپنے آپ کو نعمان اکبر کے محل کا مالک سمجھتا ہوں اور جب نشہ اترتا ہے تو پھر میں وہی گڈریا اور ساربان (اونٹوں والا) بن جاتا ہوں۔''

''وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا'' یعنی شراب اور جوئے کے مفاسد ان کے متوقع منافع کے مقابلے میں عظیم تر ہیں۔ چنانچہ شراب کے عظیم ترین مفاسد میں سے ایک عظیم مفسد عقل کا زائل ہونا ہے جو انسانی صفات میں سے سب سے عظیم صفت ہے۔ اس لیے کہ عقل کا معنی روکنا ہے اور یہی عقل انسان کو ان قبائح سے روکتی ہے جن کی طرف وہ طبعاً مائل ہوتا ہے۔ شراب نوشی کی وجہ سے مانع عن القبائح عقل زائل ہو جاتی ہے۔ اس مانع کے ہٹنے

کی وجہ سے انسان اپنی طبیعت اور فطرت کی بنا پر مختلف قبائح ورذائل کا ارتکاب کرنے لگ جاتا ہے۔

ابن ابی الدنیا کا کہنا ہے کہ ایک دن اس کا گزر ایک نشئی پر ہوا جو اپنے ہاتھ پر پیشاب کر کے اس سے اپنا منہ دھوتا ہوا کہہ رہا تھا: ''الحمد للّٰہ الذی جعل الاسلام نورا والماء طھورًا''

عباس بن مرداس سے دور جاہلیت میں کسی نے شراب نہ پینے کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا:

"ما انا بآخذ جھلی بیدی فادخله فی جوفی' ولا ارضی ان اصبح سید قوم وامسی سفیھھم"(۱۲)

''میں اپنی جہالت اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے پیٹ میں داخل نہیں کرتا اور نہ ہی مجھے یہ بات پسند ہے کہ اپنی قوم کا سردار بن کر پھر ان میں سے ایک احمق آدمی (شراب پینے کی وجہ سے) بن جاؤں۔''

دورِ جاہلیت میں قیس بن عاصم المنقری بہت زیادہ شراب پینے والا تھا۔ ایک دن نشے کی حالت میں اس نے اپنے والدین کو گالیاں دینے کے علاوہ چاند سے ہمکلامی کی اور شراب تیار کرنے والے کو بہت سارا مال دے ڈالا۔ نشہ اُترنے پر جب اس کی حرکتوں کے بارے میں اسے بتایا گیا تو شراب کو اپنے اُوپر حرام کرتے ہوئے کہا:

رأیتُ الخمر صالحة وفیھا — خصال تفسد الرجل الحلیما
فلا واللّٰہ اشربھا صحیحًا — ولا اشفی بھا ابدًا سقیمًا
ولا اعطی بھا ثمنا حیاتی — ولا ادعو لھا ابدًا ندیما
فان الخمر تفضح شاربیھا — وتجنیھم بھا الامر العظیما(۱۳)

''میں تو شراب کو مفید سمجھتا رہا حالانکہ اس میں ایسے اوصاف ہیں جو عقل مند آدمی کو بھی بگاڑ دیتے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں نہ تو تندرستی کی حالت میں اسے پیوں گا اور نہ بیماری کی حالت میں اسے بطور دوا استعمال کروں گا' میں تا زندگی کسی قیمت کے بدلے اسے نہیں خریدوں گا اور نہ شراب نوشی کے لیے کسی ہم نشین کو دعوت دوں گا' اس لیے کہ شراب' پینے والوں کو ذلیل و رسوا کر کے ان سے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرواتی ہے۔''

کچھ علماء کا خیال ہے کہ شراب کی حرمت سورۃ البقرۃ کی مذکورہ بالا آیت ۲۱۹ ﴿قُلْ فِیْھِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ .....الخ﴾ سے ہوئی ہے' چاہے کوئی دوسری آیت کریمہ اس سلسلے میں نازل نہ بھی ہوتب بھی حرمت شراب پر دلالت کرنے کے لیے یہی آیت کافی تھی' کیونکہ:

(۱) اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ شراب اور جوئے میں ''اثم کبیر'' ہے اور قرآن مجید ہی نے سورۃ الاعراف کی آیت ۳۳ ﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ.....﴾ میں ''اثم'' کو حرام قرار دیا ہے اور جب شراب میں ''اثم'' ہے اور ''اثم'' حرام ہے تو ''اثم'' پر مشتمل شراب بھی حرام ہوگی۔ مندرجہ بالا آیت کریمہ میں مذکور ''اثم'' سے بعض علماء کے نزدیک مراد شراب ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

شربت الاثم حتی ضل عقلی — کذٰلك الاثم یذھب بالعقول

''میں نے اثم (شراب) پی ہے حتیٰ کہ میری عقل کھو گئی' اسی طرح ''اثم'' (شراب) عقلوں کو کھو دیتا ہے۔''

لیکن یہ دلیل کمزور ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے البقرۃ کی مذکورہ آیت میں شراب کو اثم کہنے کے بجائے ''قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ'' فرمایا ہے' هما اثما كبيران نہیں فرمایا۔ دوسرے اس لیے کہ حضرت قتادہ کا قول ہے کہ اس آیت کریمہ میں خمر کی مذمت اور سورۃ المائدہ کی آیت ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ.....﴾ میں خمر کی حرمت بیان ہوئی ہے اور یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔(۱۴)

(۲) ''وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب کے مفاسد اس کے منافع پر غالب ہیں اور ترجیح المفسدة على المصلحة کا تقاضا تحریم (اس کام کا حرام قرار دینا) ہوتا ہے۔ مزید برآں لفظ ''اثم'' کا اطلاق کبھی سبب عقاب (گناہ) پر اور کبھی عقاب پر ہوتا ہے۔ وكل منهما لا يوصف به الا المحرم۔

لیکن حق بات یہی ہے کہ یہ آیت کریمہ تحریم خمر میں صریح نہیں ہے' جیسا کہ حضرت قتادہ کا قول اوپر ذکر ہوا ہے' کیونکہ اثم کا معنی مفسدہ ہے اور رجحان المفسدة على المصلحة مقتضی تحریم فعل نہیں بلکہ مقتضی رجحانِ تحریم فعل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ آیت کریمہ کے نزول کے بعد بھی کبار صحابہ ''انما نشرب ما ينفعنا'' کہتے ہوئے سورۃ المائدۃ کی اس آیت کے نزول تک شراب پیتے رہے جو تحریم خمر پر بطورِ نص دلالت کرتی ہے۔

سورۃ المائدۃ میں شراب کی حرمت بیان کرتے ہوئے اس کے لیے پہلا لفظ رِجسٌ استعمال کیا گیا ہے اور رِجسٌ کا معنی وہ گندگی ہے جس سے عقول سلیمہ نفرت کرتی ہوں۔ بقول امام راغب اصفہانی رِجس چار قسم پر ہے: (۱) صرف طبیعت کے لحاظ سے (۲) صرف عقل کی رو سے (۳) صرف شریعت کی رو سے (۴) ہر سہ کی رو سے' جیسے مَیتة (مردار) سے انسانوں کو طبعی نفرت بھی ہے اور عقل و شریعت کی رو سے بھی ناپاک ہے۔ رِجس شرعی جیسے جوا اور شراب کہ شریعتِ مطہرہ نے اسے رِجس قرار دیا ہے۔ بعض نے شراب اور جوئے کو صرف شرعاً نہیں بلکہ عقلاً بھی رِجس کہا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ قرآن مجید نے ان دونوں کے بارے میں ''وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا'' کہا ہے اور جس چیز کا نقصان اس کے نفع پر غالب ہو ضروری ہے کہ عقل سلیم اس سے مجتنب رہنے کا حکم دے۔ اسی طرح کفار کو رِجس قرار دیا گیا ہے' کیونکہ وہ شرک کرتے ہیں اور شرک عند العقل قبیح ترین شے ہے۔ مثلاً فرمایا: ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ﴾ (التوبۃ:۱۲۵) ﴿وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ (یونس)۔(۱۵)

دوسرا لفظ ''مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ'' استعمال کیا گیا ہے' یعنی شراب نوشی شیطانی عمل ہے' کیونکہ شیطان خود خبیث اور نجس ہے اور خبیث و نجس کا کام نجس کاموں کی دعوت دینا ہی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں شراب کی حرمت بیان کرنے کے لیے صراحتاً حرام کا لفظ اختیار کرنے کے بجائے ''فَاجْتَنِبُوْهُ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا معنی ہے شراب سے دُور دُور رہو' اس کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ اور کسی شے کی حرمت ظاہر کرنے کے لیے لفظ حرام کے استعمال کے مقابلے میں یہ لفظ بلیغ ترین ہے۔

پھر اس کی شناعت و قباحت کو مزید اجاگر کرنے کے لیے شراب سے اجتناب کو فوز و فلاح اور دنیوی و

اُخروی سعادت کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ یعنی اگر فوز وفلاح اور دُنیوی واُخروی کامیابی کے طلبگار ہو تو اس کے لیے شراب نوشی سے اجتناب شرط ہے' کیونکہ اس میں دین و دنیا کا فساد اور صحت' عقل اور مال کا ضیاع ہے۔ چنانچہ خود اللہ عزوجل نے شراب اور جوئے کے عظیم ترین اور خطرناک ترین مفاسد میں سے دو کا بالخصوص ذکر کیا ہے۔ ایک کا تعلق دنیا سے اور دوسرے کا تعلق دین سے ہے۔ دنیوی مفسدہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾

''شراب نوشی اور جوئے کے ذریعے شیطان تمہارے مابین عداوت اور بغض ڈالنا چاہتا ہے۔''

کیونکہ شراب نوشی انسانی عقل کو فاسد کر دیتی ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

شربتُ الخمر حتی ضل عقلی كذلك الخمر تفعل بالعقول

''میں نے شراب پی حتیٰ کہ میری عقل کھو گئی اور شراب عقلوں کے ساتھ یہی معاملہ کرتی ہے۔''

عقل ہی کی بدولت انسان اشرف المخلوقات ہے' اس کے من جملہ دیگر اوصاف کے افضل و اشرف ترین صفت عقل ہی ہے۔ کیونکہ عقل کا لغوی معنی روکنا ہے اور جب تک انسان کی عقل فساد و بگاڑ سے محفوظ ہو تو وہ انسان کو قبائح و رذائل سے روکتا رہتا ہے اور اگر یہی عقل فساد و بگاڑ کا شکار ہو جائے یا انسان شراب نوشی کے ذریعے اسے فاسد کر دے یا پردہ ڈال کر اسے کام کرنے سے روک دے تو پھر انسان بدترین حیوان بن جاتا ہے اور ہر قسم کا شر و فساد بصورت قتل و غارت' ظلم' فحش گوئی' افشاء راز' ملک و وطن سے غداری وغیرہ قبائح و رذائل اس سے سرزد ہوتے رہتے ہیں' جن کے اثرات صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتے بلکہ اس کے عزیز و اقارب' دوست و احباب اور پڑوسی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جس کا نتیجہ باہمی عداوت اور بغض و نفرت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے اس لیے شریعتِ مطہرہ نے اسے اُم الخبائث قرار دیا ہے' جیسا کہ طبرانی کی روایت عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما میں ہے:

ان النبی ﷺ قال: ((اَلْخَمْرُ اُمُّ الْخَبَائِثِ))(۱۶)

دوسری روایت میں تفصیل ہے جو درج ذیل ہے:

قال النبی ﷺ: ((اَلْخَمْرُ اُمُّ الْفَوَاحِشِ وَاَكْبَرُ الْكَبَائِرِ وَمَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ تَرَكَ الصَّلَاةَ وَوَقَعَ عَلٰى اُمِّهٖ وَخَالَتِهٖ وَعَمَّتِهٖ)) (۱۷)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت جو ابن ماجہ اور سنن ترمذی میں ہے' اس کے الفاظ یہ ہیں:

لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْخَمْرِ عَشْرَةً: عَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَشَارِبَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ اِلَيْهِ وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَآكِلَ ثَمَنِهَا وَالْمُشْتَرِي لَهَا وَالْمُشْتَرَاةُ لَهٗ (۱۸)

اور صحیحین' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور مسند احمد میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ درج ذیل ہیں:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((لَا يَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ

يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ)) (۱۹)

دینی مفاسد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ﴾ ''یہ شراب تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے۔''

کیونکہ شراب نوشی کے نتیجے میں جب انسان پر مستی' بے خودی اور لذت وطرب کی کیفیت غالب ہو جاتی ہے تو وہ اللہ کے ذکر اور نماز سے غفلت اور اس کی اطاعت سے اعراض کرنے لگ جاتا ہے۔ آخر میں فرمایا گیا: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ یعنی شراب نوشی کے اتنے سارے قبائح' مفاسد اور رذائل بیان کرنے کے بعد بھی تم باز آتے ہو کہ نہیں؟ انداز بظاہر استفہام کا ہے لیکن درحقیقت نہی ہے۔

الحاصل: سورۃ المائدۃ کی مذکورہ بالا آیت کریمہ شراب نوشی کی حرمت پر متعدد وجوہ سے دلالت کرتی ہے:

(۱) آیت کریمہ کے آغاز میں ''اِنَّمَا'' کلمۂ حصر لایا گیا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے گندے اور شیطانی اعمال کو خمر' میسر' اَنصاب اور اَزلام میں منحصر فرمایا' یعنی ان چاروں کے علاوہ کوئی اور کام گندا اور شیطانی عمل میں شامل نہیں ہے۔

(۲) مذکورہ آیت کریمہ میں شراب اور جوئے کو عبادتِ اوثان کے ساتھ ملا کر یہ بتایا ہے کہ خمر ومیسر عبادتِ اوثان کے مثل ہے' جیسے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ وَثَنٍ)) (۲۰) دوسری حدیث میں ((شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ اللَّاتِ وَالْعُزّٰى)) (۲۱) کے الفاظ مذکور ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے ﴿فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ امر کا صیغہ استعمال کر کے اس سے اجتناب کا حکم دیا ہے اور امر کا صیغہ وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

(٤) ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ فرما کر شراب سے اجتناب کو فلاح کا ذریعہ بتایا ہے اور اگر اجتناب فوز وفلاح کا ذریعہ ہے تو اس کا ارتکاب لازماً خیبت وخسران ہوگا۔

(۵) شراب نوشی کی دینی ودنیاوی مفاسد از قبیل باہمی عداوت وبغض اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے اعراض وغیرہ قبائح ورذائل کا بیان اس کی حرمت کی بیّن دلیل ہے۔

(٦) نہی کا بلیغ ترین انداز ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ کا اختیار کرنا ہی اس کی حرمت کی بیّن دلیل ہے۔ یعنی شراب کے گوناگوں مفاسد اور قبائح ورذائل بتانے کے بعد بھی تم باز آتے ہو یا اسی طرح اس پر مصر رہو گے؟

(۷) اس آیت کے متصل بعد ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا﴾ فرمایا گیا۔ یعنی شراب سے اجتناب کا جو حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے اس کو مانو اور اس حکم کی مخالفت سے بچو۔

(۸) اس کے معاً بعد فرمایا گیا: ﴿فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (المائدۃ) آیت کے اس ٹکڑے میں اس شخص کو تہدید عظیم اور شدید وعید سنائی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے۔ یعنی تم پر اتمامِ حجت ہو چکی ہے اور ہمارے رسول ﷺ تبلیغ وانذار کے فریضہ سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اگر اس حکم کی تم مخالفت کرو گے تو سزا دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

مندرجہ بالا آٹھ وجوہ کی بنا پر یہ آیت کریمہ تحریم خمر کے بارے میں دلیل قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔

حواشی

(۱) لسان العرب بذیل مادہ ح' د'۔

(۲) نیل الاوطار ج۷' ص ۲۵۰' دارالفکر بیروت۔ وفتح الباری' کتاب الحدود' ج۱۲' ص ۷۱۔ دارالسلام' الریاض۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ' عبدالرحمٰن الجزیری' ج۵' ص ٦۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ' وھبۃ الزحیلی' کتاب الحدود' ج۷' ص ۵۲۷٦۔ بدائع الصنائع' کتاب الحدود' ج۷' ص۳۳۔

(۳) مفردات القرآن' مترجم' بذیل مادہ ح' د' د۔

(٤) بدائع الصنائع' ج۷' ص۳۳۔ المبسوط للسرخسی' ج۹' ص ۳٦۔ فتح القدیر لابن الھمام' ج٤' ص ۱۱۲۔ تبیین الحقائق للزیلعی' ج۳' ص۱٦۳۔ حاشیہ ابن عابدین' ج۳' ص۱۵٤۔

(۵) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ' ج۵' ص ۱۷۔

(٦) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ' ج۵' ص ۱۷۔

(۷) فتح القدیر' ج٤' ص ۱۱۱۔

(۸) فتح القدیر' ج٤' ص ۲۱۱۔

(۹) الفروق' ج٤' ص ۱۷۷ تا ۱۸۳۔

(۱۰) الشرح الکبیر' دردیر و حاشیۃ الاسوقی : ج٤' ص۳۵۵۔ رد المحتار' ابن عابدین' ج۳' ص ۱۹٦۔

(۱۱) تفسیر القرطبی' جلد دوم' جز ثالث تفسیر آیت ۲۱۹سورۃ البقرۃ ۔ وتفسیر روح المعانی' جلد دوم' تفسیر آیت مذکورہ بالا۔

(۱۲) تفسیر روح المعانی' جلد دوم' تفسیر آیت ۲۱۹' سورۃ البقرۃ۔

(۱۳) تفسیر القرطبی' جلد دوم' الجزء الثالث تفسیر آیت ۲۱۹' سورۃ البقرۃ۔

(۱٤) روح المعانی' تفسیر آیت ۲۱۹ البقرۃ۔

(۱۵) مفردات القرآن' مادہ ر ج س ۔

(۱٦) سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ : ۱۸۵٤' و صحیح الجامع الصغیر وزیادتہ للالبانی : ۳۳٤٤۔

(۱۷) ضعیف الجامع الصغیر وزیادتہ للالبانی : ۲۹٤۸۔

(۱۸) سنن الترمذی' کتاب البیوع عن رسول اللہ ﷺ' باب النھی ان یتخذ الخمر خلا۔

(۱۹) صحیح البخاری' کتاب الاشربۃ' باب قول اللّٰہ تعالیٰ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ۔

(۲۰) غایۃ المأمول لابن ملقن:٤٦' راوی :ابوھریرۃ ؓ۔

(۲۱) مسند البزار' کتاب الاشربۃ۔ ومصنف ابی بکر بن ابی شیبہ' کتاب الاشربہ۔

(جاری ہے)

❁❁❁

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : چراغِ مصطفویؐ

مصنف : عتیق الرحمٰن صدیقی

ضخامت:206 صفحات' قیمت: 160 روپے' ناشر: ادارہ منشوراتِ اسلامی بالمقابل منصورہ لاہور

کتاب کے مصنف عتیق الرحمٰن صدیقی محکمہ تعلیم میں تعلیم و تدریس کی خدمات ادا کرتے رہے اور بطور پرنسپل ریٹائر ہوئے۔ وسیع المطالعہ اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت ان کی دل پسند مصروفیت ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے اسوہ و سیرت اور دیگر تذکیری و اصلاحی موضوعات پر ان کے مضامین ماہنامہ میثاق' ماہنامہ ترجمان القرآن اور ملک کے دیگر موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ زیرتبصرہ کتاب ان کے ایسے چند مضامین پر مشتمل ہے جو مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ تمام مضامین میں نصح و خیرخواہی کا جذبہ نمایاں ہے۔ اسی جذبے کا نتیجہ ہے کہ انسان اپنے ابنائے جنس کو وہ پیغام پہنچانا ضروری سمجھتا ہے جو اُس کی حقیقی فوز و فلاح کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ پھر جو بات خلوص و اخلاص کے ساتھ دوسروں تک پہنچائی جاتی ہے وہ لازماً قاری پر اپنا اثر چھوڑتی اور اس کی تذکیر کا باعث بنتی ہے اور اسے اچھے اخلاق و اعمال اختیار کرنے پر مائل کرتی اور برائیوں کو چھوڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے مضامین اس مقصد کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔

مصنف نے اپنے استدلال کی بنیاد قرآنی آیات' احادیثِ نبوی ﷺ اور سیرت کی معروف و مستند کتب پر رکھی ہے۔ جابجا قابلِ اعتماد کتبِ تفاسیر کے اقتباسات درج کیے ہیں۔ تمام مضامین میں خودنگری پر زور دیا گیا ہے تاکہ قاری کے لیے اپنا جائزہ لینے اور اصلاح کی طرف رجوع کرنے کا داعیہ پیدا ہو۔

کتاب ہر عمر کے افراد کے لیے اصلاحِ عمل اور اخلاص کا سامان مہیا کرتی ہے۔

(۲)

نام کتاب : حسین احمد مدنیؒ (سوانح وافکار)

مرتب : مولانا محمد اسماعیل

ضخامت:368صفحات قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ:مولانا سید محمد حقانی' مدرس جامعہ ابوہریرہ' خالق آباد' نوشہرہ

مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔اُن کے ہم عصر علماء نے اور بعد کے بہت سے اہل علم نے اُن کے سوانح مرتب کیے ہیں۔کسی نے آپ کے ورع وتقویٰ کے متعلق لکھا' کسی نے آپ کے رسوخ فی العلم کے بارے میں تحریر کیا اور کسی نے آپ کی سیاسی جدوجہد کو موضوع بحث بنایا۔بہرحال سید حسین احمد مدنی اعاظم رجال میں سے تھے۔مولانا محمد اسماعیل نے مولانا کی زندگی کے متعلق مختلف مصنفین کی تحریروں' آپ کے مکاتیب اور آپ کی خودنوشت ''نقشِ حیات'' سے اقتباسات کو جمع کر کے یہ کتاب مرتب کی ہے' جو آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہے۔سوانح حیات کے علاوہ کتاب کے دیگر ابواب میں آپ کے خطبات' سلوک وطریقت کے جواہر پارے اور شریعت اسلامیہ کی جامعیت خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔

مولانا سید حسین احمد مدنی برصغیر کے مشاہیر علماء ومشائخ میں نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔وہ ایک راسخ العلم عالم ہی نہ تھے بلکہ صاحب بصیرت سیاست دان بھی تھے۔وہ عالمی شہرت یافتہ اسلامی درس گاہ دیوبند میں شیخ الحدیث رہے۔کئی سال تک مدینہ منورہ میں تدریس کا اعزاز حاصل کیا۔آپ ایک متقی اور راسخ العقیدہ عالم دین تھے' حق گوئی آپ کا خاص وصف تھا۔آپ کو اپنے استادِ مکرم شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ساتھ گہری عقیدت تھی۔آزادیٔ ہند کی جدوجہد کے سلسلہ میں فرنگیوں کے کہنے پر آپ کو شیخ الہند اور اُن کے رفقاء کے ساتھ گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔اسارتِ مالٹا کے دوران آپ نے مختصر تفسیر قرآن لکھی جس کو قبول عام حاصل ہوا۔کئی بار قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔مولانا محمد علی جوہر جیسے لوگوں کو آپ کے ساتھ عقیدت تھی۔آپ تقسیم ہند کے مخالف تھے مگر انگریزوں سے آزادی کے لیے تن من دھن کی قربانی کے لیے تیار رہتے تھے۔اُن کے ایک سیاسی بیان پر علامہ اقبال معترض ہوئے' مگر جب مولانا کی طرف سے وضاحت کی گئی تو علامہ اقبال نے اسے تسلیم کیا۔

سیاسی مخالفین کی طرف سے طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرتے رہے مگر اسلامی اخلاقی پابندیوں کو کبھی پامال نہ کیا۔آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔نقش حیات آپ کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ہر معاملے میں اتباعِ سنت کی پابندی کرتے تھے۔آپ کی وفات پر ہر مکتب فکر کے علماء نے آپ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

مولانا حسین احمد مدنی ان مشاہیر میں سے ہیں جن کے سوانح حیات پڑھنے کے قابل ہیں کہ اُن کے معمولات' علم وعمل' نظم وضبط' عزم واستقلال اور سیاسی بصیرت قارئین کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

*Sa`d* in which Allah says that He created Adam with his two hands (*yadayya*), insinuating the fact that Adam is a composite being of material/physical body and a spiritual soul. The eminent Persian sage-poet Sa`di has portrayed this very truth in a couplet which can be roughly translated as:

> Man is a strange compound of substances. He has both an angelic part and a completely animal part.

Here the emphasis is on three points:

1. The breathing of Allah's spirit into man, i.e. the addition of substantial entity and faculty of God-like knowledge and will, which if rightly used, would give man superiority over other creatures.
2. The origin of evil is arrogance and jealousy on the part of Satan who saw only the lower side of man (his clay) and failed to see the higher side, his faculty brought in by the spirit of Allah.
3. That evil only touches those who yield to it, and has no power over Allah's sincere servants, purified by His grace.

The root cause of the contemporary godless, materialistic and satanic global civilization is the view that human beings are nothing but evolved animals. And this viewpoint has been given tremendous support and theoretical backing by Darwin's evolutionary theory and its attendant social, moral and political implications. Just like Azazil, modern civilization and mainstream dominant thought has also an eye only for the physical/material part of man, remaining in total oblivion of the metaphysical/spiritual component. This lopsided and one-eyed perception of the reality of man --- a consequence of scientism in contemporary epistemology --- has led to the present worldwide *dajjali* civilization. This materialistic philosophy has not remained confined to the academic circles and intellectuals; rather it has trickled down to the common populace of both the West and the East. So much so that even a large majority of Muslim intellectuals and some leaders of Islamic revivalist movements also reject the view that the soul is a separate and ontologically distinct element of human beings. Renouncing the view of soul (presented above in detail) as a divine and spiritual ontological component of man, they identify the spirit or soul with life. And this, of course, is a highly misguided opinion; a travesty of truth explicitly and unambiguously presented by the Qur`an. We can only regret this grave error committed by Muslim scholars and exegetes under the influence of Western scientistic thought.

(*To be continued*)

> "... they bowed down except Iblees; he refused and was haughty; he was one of those who reject Faith."

Verse 61 of Surah *Al-Isra* contains a more explicit reason of Satan's refusal to bow down to Adam. It reads:

> "...they bowed down except Iblees. He said: Shall I bow down to one whom Thou didst create from clay?"

Here a legitimate question arises as to how a commandment of Allah addressed to the angels covered Azazil who belonged to the created beings specified as *jinns*. The exegetes answer this question by saying that Allah's order covered both angels and *jinns* but since angels were in majority, only they were addressed. And other reason mentioned in this treatise was that Azazil had joined the lower ranks of angels on account of his extraordinary services and devotion to the Lord. Therefore, he was to comply the command of bowing down to Adam.

The important to be explored here is as to why Iblees refused to obey Allah's commandment. The verse of Surah *Al-Baqarah* does not state any reason for the non-compliance. Verse 12 of Surah *Al-A`raf* however does give a reason for Satan's disobedience:

> "He said: I am better than he; Thou didst create me from fire and him from clay." [7:12]

And in Surah *Al-Hijr*, we read:

> "(Iblees) said: I am not one to prostrate myself to man, who Thou create from sounding clay, from mud moulded into shape."

Verse 12 or Surah *Sa`d* repeats verbation the statement given in Surah *Al-A`raf*. The upshot of all the above-mentioned verses is that the real cause of Iblees's refusal to obey Allah's command was that he was only aware of the animal/bodily part of Adam and, being made out of clay and mud, it certainly was inferior to *jinns* whose source or material of creation is fire --- a decidedly superior element to clay and mud. Being himself a creation of *a`alam-e-khalq*, he was quite familiar with the animal (physical) or apparently visible part of Adam (as it also pertained to the same *alam-e-khalq*), but he knew nothing about the sphere of *amr* (*a`alam-e-amr*) and, therefore, was quite in oblivion about the supreme dignity of the spiritual part of Adam --- his soul. And as already explained above, Allah's "breathing into him of My spirit" made Adam the highest and noblest created being and only that justified his appointment as the Lord's vicegerent and representative on earth. And it was on account of the spiritual soul --- the Divine spark in Adam --- that all the angels were commanded to prostrate and bow down before him.

In philosophical parlance, it can be said that Adam was an ontologically composite being --- consisting of an animal part which pertained to the realm of *Khalq* and a spiritual element or soul that belonged to the realm of *Amr*. And it is in this perspective that we can rightly understand verse 75 of Surah

> "Behold, thy Lord said to the angels, I am about to create *bashar* from clay." [38:71]

And in Surah *Al-Hijr*, we read:

> "Behold, thy Lord said to the angels, I am about to create *bashar* from sounding clay from mud moulded into shape." [15:28]

And at both places, two verses which are literally exactly identical in the two surahs follows:

> "When I have fashioned him (in due proportion) and breathed into him of My spirit, fall ye down in obedience unto him."

The Arabic locution "*taswiya*" used at both places encapsulate the entire evolutionary process of the development of life on earth leading to the appearance of homo sapiens --- the animal prototypes of human beings. And it was only after the infusion of Divine spirit in one such prototype that it became a full-fledged human being --- Adam. The spirit or soul of Adam was previously lying in slumber in the repository of souls and its dignity and excellence was highlighted by the fact that Allah, the Most High, relates it to Himself i.e. *min ruhi* (out of my own spirit). This ontological dualism involved in the creation of Adam is of utmost significance in the metaphysical worldview of the Qur'an which is usually glossed over by contemporary modernist interpreters of the Holy Book. Addition and infusion of spirit or soul in the progeny of Adam is subtly referred to in verse 14 of Surah *Al-Mominun* where, first, the variegated stages of the development of human fetus in mother's womb are described in detail and then its formation on an entirely different pattern is stated --- viz. growing into a human being with a soul with all its capacities and responsibilities. And when Allah commanded all the angels to prostrate before Adam, all obeyed and extended the duty as ordained. Indeed, the angels always act as commanded by the Lord as verse 6 of Surah *Tahreem* tells us:

> "... Who (the angels) flinch not (from executing) the commands they receive from Allah. But do precisely what they are commanded." [66:6]

The prostration and bowing of all angels before Adam was, in fact, a sign or symbolic expression of the angels' acceptance of Adam as superior to them and Allah's vicegerent on earth. Bowing of angels, in a way, represents the coronation ceremony of Adam's appointment as Allah's deputy and recognition as the cream of all created beings.

THE REBELLION OF IBLEES AND THE REASON THEREOF

The above-mentioned seven places where Allah commanded the angels to bow down to Adam, the verses contain the assertion "except Iblees" followed by a number of slightly varying explanations given by him. For example, we read in the verse 34 of Surah *Al-Baqarah*:

the animal part of man. And this, of course, was the result of Allah's breathing into him out of His own spirit and thus infusing in him the metaphysical element of soul. It is in this perspective that we can appreciate verse 75 of Surah *Sa`d* in which Allah says that He created Adam with His two hands (*yadayya*). This perhaps is a subtle allusion to the fact that as Adam is a composite being of material/physical body and a spiritual soul i.e. both *a`alam-e-Khalq* and *a`alam-e-Amr* were fused together to constitute Adam. The Adamic first man is none other than the primordial man by virtue of his being made "in the image" (*imago Dei*) of a Divine Being. Adam is thus man *in divinis*, human in his element of *khalq* but reflective of Divine qualities and attributes as far as soul (the element of *Amr*) is concerned. And according to an authentic Hadith, a particular soul (which was kept in the repository of souls) is aligned by an angel to each and every embryo developing in the womb of a mother. Thus, the entire progeny of Adam too consist of both a corporeal and a spiritual element. It is this very spiritual element in man that makes him Allah's representative and vicegerent on earth.

The crowning of Adam as vicegerent of Allah on earth was finalized by the Divine Commandment for all angels to prostrate before Adam thus submitting to his superiority as a deputy of the Lord on earth. This order was rejected and floated by Azazil (a *jinn*, included in the lower cadres of angels on the basis of his devotion and service). Verse 34 of Surah *Al-Baqarah* reads:

> "And behold, We said to the angels: Bow down to Adam; and they bowed down. Not so Iblees, he refused and was haughty; He was one of those who reject Faith."

And in verse 50 of Surah *Al-Kah`f*, we read:

> "Behold! We said to the angels: Bow down to Adam. They bowed down except Iblees. He was one of the *Jinns*, and he broke the command of his Lord."

The word "Iblees" in verse 34 of Surah *Al-Baqarah* is derived from the root idea of desperateness or rebellion whereas "Satan" conveys the idea of perversity or enmity. The *Jinn* Azazil disobeyed the command of Allah and was denounced as Iblees and Satan. The importance of the episode of Adam and Iblees can be measured by the fact that in the Qur`an it has been mentioned six times in Makkan surahs and once in Madinese Surah of *Al-Baqarah*. Among the Makkan surahs which refer to this narration of Adam and Iblees are *Al-A`raf, Al-Hijr, Al-Isra, Al-Kah`f, Taha* and *Sa`d*. So in all it has been mentioned seven --- a sure proof of its extraordinary significance. From amongst the seven places, two from Surah *Al-Hijr* and Surah *Sa`d*, are of particularly great significance as they both mention, before the creation of Adam, the creation (or evolutionary development) and *taswiya* of *bashar*. So in Surah *Sa`d*, we read:

COMPLETION OF ADAM'S CREATION --- APPOINTMENT AS KHALIFAH

The Qur`anic theistic assertion of Allah as being the Creator, the Originator and the Fashioner render all mysterious and enigmatic questions regarding the origin of this world and the appearance of man in it intelligible and satisfactorily resolved. God is not immanent in the cosmos in the Neo-Platonic sense; He is a transcendent and a personal God to which man can turn directly for guidance. Although Allah is transcendent, the creation is not detached from Him, rather it is an expression, effect or concretization of the Divine performative word of "*kun*". The myriad forms of the created universe are differentiated in time and space, and are not part of the process of emanation. The following two verses of the Holy Qur`an clearly and unambiguously state that before the appearance of Adam, his prefigured primates in the form of "*bashar*" were created by Allah through long evolutionary process:

1. "Behold! Thy Lord said to the angels: I am about to create man (*bashar*) from clay." [*Sa`d*, 38:71]
2. "Behold! Thy Lord said to the angels: I am to create man (*bashar*) from sounding clay, from mud moulded into shape." [*Al-Hijr*, 15:28]

The word *bashar* used in these verses can refer to *Homo*, the genus of primates of which, according to evolutionary theory, modern humans *(Homosapiens)* are the present-day representative. The genus *Homo* is believed to have existed for at least two million years and modern humans first appeared in the Upper Palaeolithic. In this sense, *bashar* can denote hominid (or hominoid) --- a primate of a group that includes humans (only in the sense of living physical body prior to the breathing of divine spirit into it), their fossil ancestors, and the bipeds. There is very strong insinuation in the Qur`an that Adam was one chosen *bashar* and he became Adam after Allah blew into him out of His spirit --- a primordial truth to which atheistic evolutionists turn a blind eye. The Qur`anic verses, which speak of selection of Adam from amongst a species of humans, are the following:

i) "Allah did choose Adam and Noah, the family of Abraham, and the family of Imran above all people." [*A`le Imran*, 3:33]

ii) "It is We who created you (in the plural) and gave you shape; then We bade the angels: Bow down to Adam. And they bowed except Iblees; he refused to be of those who bow down." [*Al-A`raf*, 7:11]

Adam's being chosen by Allah and similarly creation of a multitude of human primates and crowning one individual with the title and status of "Adam" is quite significant. This essential difference is definitely due to the addition of spiritual soul --- a new and highest metaphysical element --- to

waves of successive hominids and the appearance on earth of *homo sapiens*. Because the "missing link" has yet to be found --- a link to be found only in the light of revealed datum of knowledge --- it is not possible to definitely state that there is a common lineage between the prehistoric primate and man --- the primordial Adamic man.

DR. RAFI-UD-DIN'S CHARACTERIZATION OF EVOLUTION

Essentially, following ideas presented by Rumi in his poetical lines given above, Dr. Rafi-ud-Din has pointed out three stages of the long process of evolutionary developments viz., firstly physico-chemical evolution, secondly biological evolution and, thirdly ideational or ideological evolution. This, in effect, means that the second stage of the descent of creation coincides with the first stage of evolutionary process. That is to say, as a result of the "Big Bang", tiny particles appeared which synthesized together to constitute "atoms" which in turn collectively constituted "molecules". Combination and recombination of these molecules in due course of time led first to the formation of inorganic compounds and then ultimately to the formation of organic compounds which represents the completion of the first stage of evolution. It will be noted here that we have characterized this stage as also the climax and completion of the third stage of the process of descent which has been expressed beautifully by Mirza Abdul Qadir Baydil in the words "two realms (of "*khalq*" and "*amr*") consumed ..." But since this third stage of the descent of creative impulse was also the first stage of evolution, biological evolutionary process started from this very phase.

As a matter of fact, the natural scientists have so far not been able to explain as to how the chemical compounds pertaining to the inorganic level acquired the altogether different and higher element/characteristic of "life". This, in fact, is a perennially irresolvable issue because it (as explained in the last sub-section of this essay) necessarily relates to the working of Divine agency of "*amr*" which is beyond and outside the jurisdiction of the so-called scientific enquiry and method. Indeed, it is only on account of a word "*kun*" of Allah that dead and inert matter acquired the current and throb of life and was thus elevated to an ontologically different and distinct sphere. Post-Darwin researchers have conclusively proved that changes occur in the genes or DNA of a species and these cannot be explained at all on the premises of Darwin's theory. In the miraculous birth of *Hazrat Isa (AS)*, the role of the sperm coming from the father's side was substituted by the word "*kun*" of Allah. Similarly, the word "*kun*" was used by the Almighty Allah for bringing about change in the genes of any species of animal kingdom, thus creating a new variety of living beings. And this process of evolutionary change (under Divine creativity) continued till the appearance of beings known as "homo sapiens" in the terminology of modern Biology. We will come back to Dr. Rafi-ud-Din's characterization of evolution in the form of three levels of evolutionary process --- particularly the human intellectual and social evolution --- in the last sub-section of this treatise.

random (essentially mindless and without design) mandate at the very heart of the evolutionary theory. Darwin himself had a problem with the myriad creation that reflected, if nothing else, stunning design. He, for example, well understood the development of the eye as a serious problem for his theory. He wrote:

> "To suppose that the eye with all its inimitable contrivances for adjusting the focus to different distances, for admitting different amounts of light, and for the correction of spherical and chromatic observation, could have been formed by natural relation, seems, I confess, absurd in the highest degree." (Quoted in Stephen Jay Gould, *Ever Since Darwin*, New York, 1977, p.103)

Let us, at this point, look at the guidance and knowledge provided by the Holy Qur'an. Verse 30 of Surah *Al-Anbiya* asserts:

> "We made from water every living thing. Will they then not believe?"

That all life began in water (as a result of chemical reaction between water and crust of the earth) is a conclusion to which our latest knowledge in biological science points. Apart from the fact that protoplasm, the original basis of living matter, is a liquid or semi-liquid and in a state of constant flux and instability, this is a fact that land animals, like the higher vertebrates, including man, show in their embryological history, organs like those of fishes, indicating the watery origin of their original habitat. The constitution of protoplasm, as a matter of fact, is about 80 to 85 percent water.

Classical Darwinism assumed that all changes in living things take place gradually. "Natural selection", Darwin wrote in the *Origin of Species*, "will banish the belief in the continued creation of new organic beings, or in any great and sudden modifications of their structure." This assumption of the continuity of organic changes made it difficult to understand and explain how any single modification or group of co-adapted modifications could first arise. An improved and metaphysically loaded theory of emergent evolution put forward by C. Lloyd Morgan and others maintain that such events must be discontinuous with what went before. Whatever comes to be for the first time must do so suddenly or abruptly. One function of the concept of emergence is to express this contention. In opposition to purely mechanistic or reductionist view the concept of emergence implies that the variety, diversity and complexity are novel, irreducible and high level features of the creative advance of nature.

Scientists working in paleontology and its related fields have accumulated a number of early and pre-human fragments of skulls, teeth and bones, and yet the palaeontological gaps in our knowledge of human origins are indisputable, even among palaeontologists themselves, as is the interpretation of their findings. In other words, the links are still missing between the main

end to illustrations that have been adduced in support of this view. As such it is a mere caprice on the part of those Darwinists who still cling to the theory of natural selection and do not take into account the spontaneous capacities and characteristics of living organisms which constitute a definite proof of the teleological nature of evolution.

The emergence of conscious purpose in man itself, as one of his most important characteristics, constitutes an evidence in favour of purposive evolution. The very word evolution implies purpose, since it means growth or movement towards higher and higher stages of development. Every kind of growth or development must have destination from the very beginning, otherwise it will not be any growth or development at all. The highest product of the growth of a tree is the seed and the seed is implied in the tree at every stage of its growth. If the universe has really evolved and developed upto its present stage does it not mean that purpose, one of the most precious products, of its development, was implied in it from the beginning, that purpose of some sort was present at every stage of its development? At the material stage it was entirely unconscious, at the biological stage it was half conscious, at the human stage it became completely conscious and deliberate.

A purely scientistic and agnostic man finds himself in the uncharted territory of an exploratory and descriptive science rather than the revealed and illuminating knowledge of the traditions, a knowledge that was the embodiment of a sacred science and a repository of meaning for the enigmatic mysteries of life. There is a need for a perceptive approach to man's origins and ends that can contextualize man's perception of self within a framework of comprehensibility and meaning. The scientific evolutionary narrative provides modern man with a terrestrial lineage of development that commences with a single replicating cell and ends with the spectacular transition from animal primate to conscious human. As a result, Godless Darwinian evolutionary theory has completely recast the mindset and mentality of people everywhere with its hypothetical explanation of man's origin and by implication his spiritual and ultimate destiny. That also explains why both Karl Marx and Engels highly appreciated the contents of Darwin's books and Marx even desired to dedicate "Das Capital" to Darwin.

By any stretch of imagination, the origin and progression of organic life on earth in all of its diversity and uniqueness through multiple, innumerable species cannot be the result of blind mutations and mindless transformations. The development of such things as organs and limbs and shells and skins of animals and humans can only be the result of a fundamental intelligence being manifested at every level of existence. Indeed, what is intelligence if not the very manifestation of pattern, order, design, uniqueness, function, meaning, and fullness and fulfillment of intention. In this sense, the cells, molecules and atoms that represent our flesh make our flesh virtually intelligent in a manner in which they create and maintain a living organism. An exquisite reality of organic forms belies the blind, spontaneous and

Economics and Politics. Indeed, if Darwinism with its radical opposition to teleology and its stress on mechanical selection is really an adequate explanation of a part of the evolutionary process, it ought to be an adequate explanation of the whole of it. As was only natural, Darwinism has deeply influenced all subsequent developments of the human and social sciences. It has yielded many bitter fruits and the bitterest of them all is Marxism and totally materialist interpretation of history, morals and religion.

"My theory", said Darwin "will lead to a whole philosophy". He was right. But the philosophy that results from the theory of Darwin is a terrible shock to man's justified conviction of his own dignity over the rest of creation, which he thinks he enjoys by virtue of the nobility of his mind and spirit and the sanctity of his reason and free-will. For the implications of his theory are that the whole of this wonderful world of life is nothing but the blind and fortuitous play of the reckless forces of nature. It is completely devoid of plan or method. What is now a human being may have been a worm crawling in a gutter. The higher activities of man like religion, morality, politics, arts, science, philosophy, law and education have no worth or value of their own, since their very basic *i.e.* the conscience of man and his desire for ideals is the result of an accident, a chance product of ignoble tumult of animal impulses, desires and sensations which may not have come into existence at all.

The spirit of man revolts against such ideas and their scientific accuracy at once becomes doubtful. No wonder, therefore, that there were soon many powerful rebels in the Darwinist camp. Wallace, the co-discoverer of the Darwinian theory of the struggle for existence, ultimately came to believe in a spiritual explanation of evolution. Romanes, a prominent disciple of Darwin, ended in Christian theism. Fleischmann kept illustrating the orthodox Darwinian standpoint during many years of personal research, but finally developed into an outspoken opponent of not only the theory of selection but also of the doctrine of descent. Friedmann did the same. Driesch started with a mechanical theory of life but wrote a series of essays to show that life is fundamental and evolution is purposive. Among the founders of constructive theories of evolution opposed to Darwinism may be counted Lamarck, Etienne Geoffroy, St. Hilaire, Ersner, Kassowtz, W. Haacke, Nageli, De Vries, Driesch and Bergson. Suffice it to say that the commonest and the most prominent feature of all these theories is that a living organism has not to wait passively for natural selection and prolonged accumulation of minute variations. On the other hand, there is a hidden purpose working in and through the organism that enables it spontaneously and of itself to bring forth what is necessary for self-maintenance, often what is new and different with an extensive range of possibilities. It is, for instance, able to produce protective adaptations against cold or heat, to regenerate lost parts, often to replace entire organs that have been lost and under certain circumstances to produce new organs altogether. There is no

existence, was so far going unnoticed. In this controversy, some eminent biologists like Thomas Huxley and Ernest Haeckel championed the cause of evolution and defended the views of Darwin both as regards the occurrence of evolution and the factors responsible for its occurrence. Their critics, on the other hand, refuted these views wholesale with the result that Darwinism and evolution came to be identified with each other on both sides. While the scientists have now accepted the fact of evolution, the controversy about Darwinism still persists although it is perfectly true to say that Darwinism is rapidly losing its ground and its opponents are already on the way to a complete victory. Indeed if we take into consideration, what we hear and read in scientific circles and journals again and again, we have to conclude that even now there is no dearth of serious students of evolutionary science who believe that Darwinism has already collapsed.

Briefly, the theory of Darwin is that it is in the nature of life to vary. The whole organism and its individual organs and functions are subject to minute variations which occur blindly and haphazardly in any and every direction. Moreover, all species of animals have to struggle against a hostile environment, against their enemies and dangers of every kind in order to feed and protect themselves and their offspring. In this struggle only the fittest species are able to maintain their race; all others perish. This means that nature favors the maintenance and further development of only that accidental change of shape, colour, structure, function or instinct which renders the animal better able to secure food for itself, to grasp its prey, to avoid or defeat its enemies, to protect its offspring, to propagate its species and so on. Without choice, without aim and without conscious purpose nature offers a wealth of variations, the conditions of existence act as a sieve, variations which correspond to them maintain themselves gliding through the meshes of the sieve, those that do not disappear. In this process of passive adaptation, the forms of life are raised from the originally homogeneous to the heterogeneous, from the simple to complex, and from the lower to the higher. The absence of purpose is the very essence of Darwinism. Variations arise fortuitously out of the organism and present themselves for selection in the struggle for existence. They are not actively acquired by means of struggle. If there is any purpose in evolution, it is, according to Darwin, apparent and not real. Darwinists endeavor to explain the emergence of even the most complicated organ such as the eye and the most puzzling function such as the instinct of a bee, as a result of a series of accidents. This position is, of course, completely antagonistic to that of teleological evolutionists like Lamarck, Bergson and Iqbal.

Darwinism has passed through several stages and undergone several differentiations and transformations since its birth but its essence and main features have remained the same. Although it is primarily a biological theory, the Darwinists use it to answer all questions relating to Psychology, Metaphysics, Logic, Epistemology, Ethics, Aesthetics and even History,

verses. It is, however, reassuring to note that an able expounder of the wisdom of Iqbal --- Dr. Mohammad Rafi-ud-Din --- has made his ideas understandable and easy to grasp in an article published in April 1960 issue of "Iqbal Review".

DARWIN'S THEORY & ITS FLAWS

No doubt, Charles Darwin (1809-82), through his long and arduous voyage on Beagle and accumulation of fossils, promoted the theory that organisms tend to produce offspring varying slightly from their parents. He, however, failed miserably to explain the mechanism by which new species may arise widely different from each other and from their common ancestors. Unfortunately, the ordinary educated person too often identifies the fact of evolution with its cause and ignores that to say that evolution has occurred is not the same thing as to believe in its cause as explained by a particular philosopher or scientist. It is, however, easy to see that to know a fact is not the same thing as to know its cause. A man who believes in the fact of evolution is generally imagined to be a Darwinist, although Darwinism is a theory relating to the cause of evolution and not to its fact. Darwinism is not evolution, nor is evolution Darwinism.

The idea of evolution became a subject for scientific study even in the domain of science long before Darwin had said anything about it. The European who first put forward the idea of evolution in its modern scientific form was Buffon, the French naturalist. Goethe in Germany and St. Hilare in France received it with enthusiasm. The latter in fact called attention to the embryological evidence in its favour. However, the true father of the modern theory of evolution is another French naturalist Lamarck (1744-1829) whose epoch-making work on *Zoological Studies* was published in 1809 and he presented a purposive or teleological evolution as against the merely passive and mechanical evolution of Darwin. Unfortunately, however, Lamarck did not receive in his lifetime the recognition that he deserved. The idea of evolution was widely known and understood only after Charles Darwin had published his *Origin of Species* and Wallace had stated that he, working independently, had arrived at similar results. Darwin soon followed up his first publication by his *Descent of Man*. Since then the theory of evolution has found an increasing confirmation in practically every field of science especially in Physics, Astronomy, Geology, Biology, Sociology, Embryology, Paleontology and Comparative Anatomy. Darwin not only collected and systematized all evidence for evolution that could be available in his own days, but also put forward the view that Natural Selection, through the survival of the fittest in the struggle for existence, is in itself a complete explanation of the cause of evolution. It is this particular explanation of evolution that is known as Darwinism. Darwin's books, however, created a fierce controversy about the fact of evolution because they attracted the attention of the common intellectual, for the first time, to a theory that questioned his age-old beliefs and assumptions and which, though long in

geological world of minerals and hard rocks and then after dying in that realm he appeared in the botanical world of plants and trees. And then after experiencing death from that stage he arose in the realm of living animals. Continuing the evolutionary thrust, from the animal kingdom he appeared in the human realm. He says he remains undaunted by physical death as a human being as this cannot take away or lessen his essential being from him which is likely to move on to two still higher stages (which are not relevant to our discussion here but Arberry's translation of those verses has been given for thoughtful readers).

Further, in Book IV of the *Mathnawi*, the Maulana presents verses formally under the title "The method and stages of the creation of Adam from the beginning of creation". Indeed, the evolutionary idea of the multifarious created beings has been expressed in very bold and categorical words. His inimitable lines may be quoted here:

The evolution of man.
First he appeared in the class of inorganic things,
Next he passed there into that of plants.
For years he lived as one of the plants,
Remembering naught of his inorganic state so different;
And when he passed from the vegetive to the animal state
He had no remembrance of his state as a plant

Again, the great Creator, as you know,
Drew man out of the animal into the human state
Thus man passed from one order of nature to another,
Till "he" became wise and knowing and strong as he is now.

One of the learned Urdu translators of the *Mathnawi*, Qazi Sajjad Husain, has translated these verses in a way as if "he" refers to the soul of man --- in parentheses he gives the word spirit or soul --- "*rooh*" --- for "he". That is quite erroneous from the point of view of our analysis given above in this treatise. That is simply because the soul is an entity belonging to the sphere of "*amr*" and as such it has not undergone any descent or evolutionary ascent. In fact, the entire evolutionary process described above in detail pertains to the physical/material part of existence only and had nothing to do with the spiritual component or soul of human beings. Also noteworthy is Rumi's mention of forgetting the conditions of earlier stages through which a being passes while progressing to the higher realm.

The most profound appreciator of the deep meaning and significance of the Qur'anic themes and Rumi of our age --- Allama Mohammad Iqbal --- has also expressed the idea of evolution in his poetry. He not only mentions the idea, he also opines about its causes, starting-point and ultimate reaches and objectives of the evolutionary process. He discusses and expounds these ideas at such a lofty level of sophistication and intellectual vision that people of ordinary mental capacity can hardly comprehend the real import of those

THE PROCESS OF CREATION
A QUR`ANIC PERSPECTIVE

(2)*

Original Text in Urdu by **Dr. Israr Ahmad**
Rendered into English by **Dr. Absar Ahmad**

THE IDEA OF BIOLOGICAL EVOLUTION ON EARTH

The widely held belief that Charles Darwin (1809-1882) is the first initiator of evolutionary theory is quite wrong. Somehow this idea has become so popular that for ordinary folk evolution and Darwinism have almost become synonymous. However, the historical fact is that as far as the essential idea of evolutionary development is concerned, one can find it as far back as ancient Greek Thought. Quite a few Greek sophos including Aristotle have referred to it obliquely. Several centuries ago, Muslim thinkers --- Brethren of Purity, Allama Jahiz (d. 225 A.H.) and Ibn Maskawayh (d. 421 A.H.), among others, have maintained it quite explicitly. However, Maulana Rumi (d.1273 A.D.)--- about six hundred years earlier than Darwin --- has exquisitely described the various stages of evolution in his well-known and universally acclaimed *Mathnawi*. At two places in the long Persian epic, he described the stages of evolution in clear, unambiguous words and in great detail. In Book III of the *Mathnawi*, Maulana Rumi says:

I died as a mineral and became a plant,
I died as plant and rose to animal,
I died as animal and I was Man.
Why should I fear Death?
When was I less by dying?

Yet once more I shall die as Man, to soar with angels blest;
But even from angelhood I must pass on,
All except Allah doth perish.

When I have sacrificed my angel-soul,
I shall become what no mind e`er conceived.
Oh, let me not exist! For non-existence proclaims in organ tones,
"To Him we shall return"

(*Translated by A. J. Arberry*)

The ideal of evolution is very clearly present in these verses. Speaking on behalf of the mankind, the Maulana says that he was first present in the

---

* Part I was published in "Hikmat e Quran" April-June 2010.

for that period. However, she is allowed to leave the house after her waiting period (i.e. four months and ten days) is over, if she desires so.

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝

(241) And for the divorced women should be a benefit in a reasonable manner being an obligation over the God-fearing.

This is an extra grant to every divorced woman in addition to the dowry, whether the marriage was consummated or not.

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

(242) Thus Allah makes clear for you His Ayaat so that you may behave sensibly.

From here, we again return to the subject of *Jihad*. As mentioned earlier, this *surah* was revealed just before the Battle of *Badr* and the Muslims in *Madinah* who were expelled from *Makkah* were again and again asking the Prophet (SAW) to permit them to fight. But when they were commanded to fight, some of them became reluctant and began to lose heart. So Allah (SWT) mentions the following incidents from the history of the Israelites to encourage them and to exhort them to do *Jihad*.

Endnotes

[58] Surah An-Nisa (4): 34.

[59] See Tafsir Ibn Kathir in his explanation of Al-Baqarah ayah 229 , Tuhfat Al-Ahwadhi 4: 363 and Towards understanding the Qur'an by Syed Abu A'la Mawdudi in explanation of this ayah.

[60] This ill-practice is known as *Halalah*, where a woman marries another man only to make her eligible for her ex-husband. If she then marries her first husband, their marriage will be void and null and it will be considered as an act of adultery.

[61] Namely Fajr (the morning prayer), Dhuhr (when sun starts declining), Asr (the middle or the afternoon prayer), Maghrib (evening), and Isha (night).

[62] Al-Muwatta 1 : 184, Sahih Muslim 1: 478, 479, Abu Dawud 2: 40, At-Tabari 5 :247.

[63] According to the majority of scholars, this ayah is abrogated by the ayah 234 of this surah and ayah 12 of surah An-Nisa (4). See Tafsir Ibn Kathir.

***

Allah (SWT) has ordained for a husband who divorces his wife before the consummation of marriage but after the fixation of the dowry, to give his wife half of the dowry unless she wants to waive it in his favor *"or waives the one in whose hand lies the marriage-knot"* i.e. if the husband wants to pay the dowry in full instead of giving half of it, he may do so. *"And that you waive is closer to piety."* This refers to the husband giving up his half of the dowry and paying the woman in full.

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾

(238) Protect the prayers, especially the middle prayer and stand up before Allah with devotion.

Allah (SWT) has made it obligatory for all the Muslims to perform the five daily prayers [61] in their fixed times. This is an extremely important tenet of Islam and has been enjoined with great emphasis both in the Holy *Qur'an* and the sayings of Prophet Muhammad (SAW). According to one of his sayings, it is the borderline between a Muslim and a non-believer. *"Especially the middle prayer."* The word *'Wusta'* carries two meanings; middle and excellent. Thus *As-Salat-ul-Wusta* means the middle prayer as well as the excellent prayer. According to the majority of scholars the middle prayer referred to in this *ayah* is the *Asr* prayer. *"And stand up before Allah with devotion"* i.e. in humility and humbleness with full concentration and presence of mind.

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾

(239) And if you are in fear, then (offer prayer) on foot or while riding. And when you are in peace and security, commemorate Allah as he has taught you what you did not know.

This is known as *Salat-ul-Khawf* (Fear prayer). If there is intense fear while traveling or in a battle, when the time of prayer comes, it is lawful for a Muslim to offer his *Salah* (prayer) standing on foot or riding and praying only one *rak'ah* behind the Prophet (SAW) whether facing the *Qiblah* or otherwise.[62] *"When you are in peace & security, commemorate Allah as he has taught you what you did not know"* i.e. say the prayer as Allah (SWT) has taught you through His Prophet (SAW).

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾

(240) And those of you who die and leave behind wives should execute a will for their wives – to benefit them for a year without expelling, but if they themselves leave, then there is no sin upon you for whatever they have done for themselves in a fair manner. And Allah is Mighty, Wise. [63]

In this *ayah*, Allah (SWT) commands a husband to bequeath maintenance for his wife (other than what a widow inherits) for a year after his death and that she should be allowed to remain in his house

This is the prescribed *iddah* for a widow including the cases where the marriage was not consummated. But in case a widow is pregnant, her *iddah* goes upto the time of delivery of her child. When the waiting period of a widow ends, she may adorn herself and accept a proposal for marriage in an honorable manner.

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

(235) *And there is no sin on you if you hint as a proposal to the widows or conceal it in your hearts. Allah does know that you will certainly bear them in mind. But do not make an agreement with them secretly, except that you utter some fair words. And do not resolve on marriage-knot until the prescribed period reaches its end; and keep in mind that Allah knows whatever is in your hearts, so fear Him, and keep in mind that Allah is Oft-Forgiving, Most-Forbearing.*

Allah (SWT) has allowed a person to make an indirect proposal of marriage to a widow within her waiting period or conceal it in his heart till her *iddah* ends, but has forbidden making any promises or secret arrangements for marriage with her within the waiting period.

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَي الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَي الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَي الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(236) *There is no sin on you if you divorce women while you have not touched them yet, or settled for them any dower. So give them something anyhow – upon the affluent according to his capacity and upon the poor according to his capacity – a benefit in a fair manner, being an obligation upon those who excel in righteousness.*

Allah (SWT) has allowed a husband to divorce his wife before consummating the marriage or settling the dowry. However, there should be some compensation for the divorced woman after the marital relation has been broken and the husband should give provision to her according to his means, whether he is rich or poor, *"being an obligation upon those who excel in righteousness"* i.e. on those people who are keen to earn Allah's pleasure by following His commandments.

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

(237) *And if you divorce them before you have touched them but you have fixed a dower for them, then one-half of what you have fixed (is payable) except that they waive, or waives the one in whose hand lies the marriage-knot. And that you waive is closer to piety, and do not forget liberality among yourselves. Verily, Allah is Watchful of whatever you do.*

who, among you, believes in Allah and the Last Day. That is more decent and chaste for you. And Allah knows whereas you do not know.

This *ayah* warns the *Wali* (guardian) and the relatives of a woman not to prevent her from remarrying her husband who had divorced her once or twice but did not reunite with her within the waiting period, provided they can live on honorable terms with each other. *Therewith being admonished is one who, among you, believes in Allah and the Last Day.* Only a firm believer follows Allah's commandments in their true spirit, while those who do not have a firm belief in Allah (SWT) and the Hereafter, do not pay heed to the admonishment from Him.

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ
فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٣﴾

(233) And the mothers shall breast-feed their offspring for two complete years, (it is) for one who intends to complete the breast-feeding. And on him to whom the child is born, is the liability of their feeding and clothing in a fair manner. No one is burdened beyond his capacity. Neither a mother should be harmed due to her child, nor should a father due to his child, and upon the father's heir is the same liability. But if they both intend to wean with mutual consent and consultation, then there is no sin upon them both. And if you intend to have a foster-mother for your offspring, there is no blame on you provided you pay off what you are to pay, in a fair manner. And fear Allah and be sure that Allah is Watchful of what you do.

In this *ayah*, Allah (SWT) commands the mothers to suckle their children for two years and not beyond that period and states that it is the responsibility of the father to provide the mother and his child with reasonable clothing and food according to his means. Each of the parents must fulfill their part in the fostering of the child and none of them should be burdened with what is more than their capability. There should be a mutual consent regarding whether they decide to wean the child or the father assumes the custody of the child and brings in a foster-mother for his offspring. In any case, the father should kindly give the mother her expenses for the care and suckling of the child.

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٣٤﴾

(234) And those of you who die and leave behind widows, such widows must hold themselves back (from remarrying) for four months and ten days. So when they reach (the end of) their waiting period, then there is no sin on you for what they do for themselves in a reasonable manner. And Allah is Aware of whatever you do.

(230) *So if he divorces her (for the third time), then she will not be lawful for him thereafter unless she marries a husband (man)* other than him. Then if he divorces her too, now there is no sin upon both that they return to each other provided they think that will maintain the limits set by Allah. And these are the limits set by Allah which He makes clear for a people who know.*

This *ayah* means that if a person divorces his wife for the third time, he cannot take her back and the decision will be irrevocable. Then if she marries another man, who after having consummated the marriage, divorces her in normal circumstances and not only for paving way for her to marry her ex-husband, [60] it is allowed to her to marry her first husband, provided that they can live together honorably. *"And these are the limits set by Allah which He makes clear for a people who know."* It is incumbent on a believer to act according to the commandments given by Allah (SWT). These are the bounds set by Allah (SWT) which must not be transgressed in any case.

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوٓا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾

(231) *And when you divorce women and they reach (the end of) their waiting period, then either retain them on equitable terms or set them free on equitable terms, but do not hold them back to inflict harm and to violate the limits. And whoever does that has indeed wronged his own soul. And do not make the Ayaat of Allah a mockery. And remember the blessing of Allah upon you and that which He has sent down to you of the Book and the wisdom, He admonishes you therewith; so have regard of Allah and keep in mind that Allah is Well-Acquainted with everything.*

This *ayah* states that it is not lawful for a person to reunite with his wife within the *iddah* simply to harass her or punish her. If a person really intends to take her back, he should do so with kindness and in a way that is pleasant for both of them. Otherwise, he should let her go in a graceful manner. *"And whoever does that has indeed wronged his own soul"* i.e. he will be responsible for the consequences if he defies Allah's commandments. *"And do not make the Ayaat of Allah a mockery. And remember the blessing of Allah upon you and that which He has sent down to you of the Book and the wisdom, He admonishes you therewith;* i.e. Allah (SWT) has given you the Book and Wisdom for your guidance. Therefore, it does not behoove you to make a mockery of Allah's revelations or to defy His prescribed laws.

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾

(232) *And when you divorce women and they reach (the end of) their waiting period, do not prevent them from marrying their husbands when they are agreed mutually on reasonable terms. Therewith being admonished is one*

degree of advantage over women physically and by means provided to them, as Allah (SWT) says: *"Men are the protectors and maintainers of women because Allah (SWT) has given the one more strength than the other and because they support them from their means..."* [58]

"And Allah is Mighty, Wise." Allah (SWT) is Mighty and all His decisions and orders are based on wisdom which may or may be not evident to us.

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ
يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ
فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

(229) *The divorce is twice, thereafter either to retain honorably, or to release in a fair manner. And it is not lawful for you that you take anything back out of what you have given them, except if they both fear that they would not maintain the limits set by Allah. But if you fear that they both will not maintain the limits set by Allah, then there is no sin on both for whatever she waives for her freedom. These are the limits set by Allah, so do not transgress them. And whosoever transgresses the limits set by Allah, those are the unjust.*

Before the advent of Islam, one of the horrible practices of the Arab society was that a husband would pronounce divorce as many times as he wished. He would divorce his wife repeatedly and then take her back whenever he wished. This *ayah* put an end to this cruel practice and Allah (SWT) made the divorce thrice, where the husband is allowed to take her back after the first and the second divorce within the *iddah* (waiting period), but as soon as he divorces her for the third time, his wife is separated from him permanently. *"Thereafter either to retain honorably, or to release in a fair manner"* i.e. if a husband decides to take his wife back after the first or the second divorce, he can do so within the *iddah*, but if he does not do so, he should let her go with kindness. *"And it is not lawful for you that you take anything back out of what you have given them, except if they both fear that they would not maintain the limits set by Allah."* After a husband divorces his wife, he is not allowed to take anything out of the *Mahr* (dowry) or from the gifts he has given to his wife *"But if you fear that they both will not maintain the limits set by Allah, then there is no sin on both for whatever she waives for her freedom."* This is known as *Khula'* in Islamic law i.e. if a wife dislikes her husband and cannot live with him, she is allowed to free herself from the marriage by giving up her *Mahr* totally or partially and the husband has to accept that and divorce his wife. *"These are the limits set by Allah, so do not transgress them. And whosoever transgresses the limits set by Allah, those are the unjust."* The limits set by Allah are His rulings and commandments. This *ayah* also alludes to the fact that pronouncing three divorces in one go is not right. The Prophet (SAW) also denounced this practice very severely. [59]

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ
يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

ordained, thereafter if they revert back, Allah is Most-Forgiving Most Merciful.

Such a separation between a husband and his wife is called *'Eela'* where a husband vows not to sleep with his wife for a certain period. But the *Qur'an* ignores such oaths concerning disassociation with wives and gives four months for reconsideration and reconciliation. *"Thereafter if they revert back, then Allah is Most-Forgiving Most Merciful"* i.e. if they return to their wives within the prescribed four months, Allah (SWT) will forgive them.

وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝٢٢٧

(227) But if they resolve to divorce, then Allah is All-Hearing, All-Knowing. i.e. Fear Allah (SWT) and do not divorce your wives for unjustifiable reasons, for He knows everything.

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝٢٢٨

(228) And the divorced women must hold themselves back for three periods. And it is not lawful for them that they conceal whatever Allah has created in their wombs, if they really believe in Allah and in the Last Day. And their husbands have preferred right to take them back in the meanwhile provided they intend reconciliation. Women have rights in proportion to the liabilities over them, in a fair manner; however, the men have a degree over them. And Allah is Mighty, Wise.

This *ayah* describes the *iddah* (waiting period) of a divorced woman. She is required to keep herself in waiting for three menstrual periods, before she can remarry if she wishes. *"And it is not lawful for them that they conceal whatever Allah has created in their wombs, if they really believe in Allah and in the Last Day."* If the woman finds out that she is pregnant, it is not lawful for her to hide that from her husband, neither is it legitimate for her to hide the knowledge of her menstruation cycles. Allah (SWT) warns women not to conceal the truth in order to act according to their own desires. *"And their husbands have preferred right to take them back in the meanwhile provided they intend reconciliation"* i.e. the door of reconciliation remains open and if the husband wants to take his wife back before the expiry of *iddah* (waiting period), he can do so. *"Women have rights in proportion to the liabilities over them, in a fair manner."* This *ayah* states that a woman has certain rights over her husband as he has rights over her. A woman should take care of her husband's property and honour in his absence, look after the house and the children and should also take care of her appearance so as to please her husband. Similarly a husband has the responsibility to spend on her food and clothing and to take care of her in all other affairs. That is why Allah (SWT) says: *"However, the men have a degree over them"* i.e. men are the protectors and maintainers of women, and hence are given a

The Muslims have been commanded not to have sexual intercourse with their wives until they get purified from menstruation. After that, Allah (SWT) commands the Muslims to approach their wives in only the manner ordained by Him i.e. avoiding impurity and filth in sexual relations. And Allah (SWT) says: *"Verily Allah loves those who repent often and He loves those who keep themselves clean & pure"* i.e. those who repent for their sins and avoid sexual immorality.

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾

(223) *Your women are tillage for you, so come to your tillage in whatever manner you like and send ahead for your own selves. And fear Allah and keep it in mind that you are to meet Him and give glad tidings to the believers.*

In the previous *ayah*, Allah (SWT) has commanded the believers to approach their wives only in the manner ordained by Him. This *ayah* illuminates what that manner is by affirming that a woman is a field for her husband, who should sow his seed in order to reap the harvest and not cultivate it in a wasteful or unnatural way. *"And send ahead for your own selves."* Sending ahead means acting with the Hereafter in mind, striving to attain success in the eternal life, and keeping the highest spiritual goal i.e. to meet Allah (SWT) on the Day of Resurrection in mind.

وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَانِكُمْ أَن تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٤﴾

(224) *And do not make Allah by your oaths, a shield against your doing good, observing righteousness and setting things right between people. And Allah is Ever-Hearing, Ever-Knowing.*

Allah (SWT) prohibits the believers to make an oath in His name an excuse for not doing the right thing or refraining from guarding against evil or making peace between two parties, reminding them that He is *"Ever-Hearing, Ever-Knowing"*.

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٢٥﴾

(225) *Allah will not hold you accountable for what is vain in your oaths rather he will hold you accountable for that which your hearts have earned. And Allah is Oft-Forgiving, Most-Forbearing.*

Allah (SWT) will not hold anyone accountable for unintentional oaths, but will call to account for the vows made deliberately. There is neither any expiation for such an unintentional oath nor any punishment. *"And Allah is Oft-Forgiving, Most-Forbearing"* i.e. He forgives the mistakes of His servants made unintentionally.

لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِن فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢٦﴾

(226) *For those who swear to abstain from their wives, a waiting for four months is*

the Hereafter. *"And they ask you about the orphans."* The Companions (RAA) asked the Prophet (SAW) about the properties of the orphans getting mixed up with their properties. Allah (SWT) revealed the commandment in this connection, ordering them to do what was best in the interest of the orphans and allowing them to join their food with that of the orphans. At the same time, Allah (SWT) warned them that He knows the intentions of those who want to cause mischief and those who are sincere in the welfare of the orphans. *"And had Allah wished, He would have put you in trouble. Verily Allah is Dominant, Wise"* i.e. if Allah had wanted, He could have afflicted you or put you in difficulty by disallowing the intermingling of things with the orphans, but He did not. So you should deal with them justly and obey Allah's commandments.

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۗ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٢١﴾

(221) And do not marry 'Mushrik' women (idolatresses) until they believe. And definitely a believing slave woman is better than a Mushrik woman, though she may fascinate you. And do not give (your women) into marriage to 'Mushriks' (unbelievers) until they believe; and definitely a believing slave is better than a 'Mushrik' even though he may fascinate you. They call you to the Hell whereas Allah invites you towards the Paradise and forgiveness by His grace, and He makes clear His signs for people so that they may observe the advice.

Through this *ayah*, Allah (SWT) has prohibited the believers from marrying idolatresses, spelling out that no matter how much an unbelieving woman attracts them, a slave woman who does not worship anyone or anything besides Allah (SWT) is much better than her. Similarly Allah (SWT) has commanded the Muslims not to marry their daughters to unbelieving men, explicating that a Muslim slave is better then an idolater, even if he is a wealthy person and pleases them greatly. The reason for this prohibition is that the *Mushriks* invite the believers to the Hellfire i.e. the love of a *Mushrik* may cause a believer to love the worldly life more than the life of the Hereafter and thus cause him to be a dweller of the Hell. On the other hand, Allah (SWT) invites the believers to earn His forgiveness, blessings and the best of rewards in the form of the Paradise by following His commandments and abstaining from what He has prohibited.

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿٢٢٢﴾

(222) And they ask you about menstruation. Say: "It is discomfort, so keep away from women during menstruation and do not go near them until they are cleansed. But when they cleanse themselves, then approach them from where Allah has commanded you. Verily Allah loves those who repent often and He loves those who keep themselves clean and pure.

cruelty so as to force the Muslims to forsake their faith. *"And whoever of you turns back from his faith then dies as a disbeliever--so such are the people whose deeds have gone waste in this world and in the Hereafter. And those are the companions of the Fire; they will be therein 'eternal residents'."* Those who were weak in faith could not bear the pressure and lost their faith in Allah (SWT). So Allah (SWT) says that those who turn their backs on faith and die in that state, will be the losers in this life as well as in the Hereafter and their abode will be the Hellfire forever.

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

(218) Verily those who believed and those who migrated and fought (and strove and struggled) in the path of Allah (SWT), they have the hope of the Mercy of Allah. And Allah is Oft-Forgiving, Most Merciful.

In stark contrast to the characteristics of the disbelievers who create *Fitnah*, the believers suffer from persecution and exile, struggle for Allah's sake and remain devoted to Him through all torment and oppression in the hope of His Mercy and Pleasure.

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١٩﴾

(219) They ask you concerning wine and gambling. Say: "In both there is great sin and some benefits for the people; but the sin of both is greater than their benefit". And they ask you as to what they should spend? Say: "Whatever is beyond your needs". Thus Allah makes His Signs clear to you, so that you may ponder.

This was the first injunction concerning intoxicants and gambling, which did not explicitly prohibit them. The final prohibition was revealed later, which is in *Surah Al-Maidah*. The *ayah* continues, *"And they ask you as to what they should spend? Say: "Whatever is beyond your needs"*. Allah (SWT) is encouraging the believers to spend in His way whatever they can spare after fulfilling their own needs and those of their families and relatives.

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٢٠﴾

(220) Upon this world and the Hereafter. And they ask you about the orphans. Say: "To improve their lot is the best. But if you intermix (affairs) with them, then they are your brethren. And Allah knows him who spoils from him who improves. And had Allah wished, He would have put you in trouble. Verily Allah is Dominant, Wise."

The first part of this *ayah* is connected with the *ayah* before it. *"Thus Allah makes His Signs clear to you, so that you may ponder--upon this world and the Hereafter* i.e. Allah (SWT) has made His revelations clear for all to understand, so that one may reflect upon this worldly life and

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Al-Baqarah

(Ayaat 217-242)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۠ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

(217) They ask about fighting in the Sacred Month. Say: "Fighting therein is a grave (sin), but to obstruct from the way of Allah, and to disbelieve in Him and (to obstruct from) the Sacred Mosque; and to expel its people therefrom is more heinous in the sight of Allah. And Fitnah is worse than killing. And they will not cease fighting against you unless they turn you back from your faith, if they could. And whoever of you turns back from his faith then dies as a disbeliever--so such are the people whose deeds have gone waste in this world and in the Hereafter. And those are the companions of the Fire; they will be therein 'eternal residents'.

A group of Muslims under the leadership of *Abdullah Bin Jahsh* (RA) killed one of the disbelievers of *Quraysh*, at the place of *Nakhlah*. The Muslims thought that it was the thirtieth of *Jamadi-uth-thani*, the month before *Rajab*, but the new moon had already been sighted the evening before and it was the first day of *Rajab*. Now, *Rajab* is counted among the sacred months, and Arabs considered it a great sin fighting in those months. Therefore, the polytheists started accusing the Prophet (SAW) and his Companions (RAA) of the violation of the sanctity of the sacred months. Allah (SWT) affirms the sanctity of the holy months in this *ayah* but says that *Fitnah* i.e. creating disorder in the land, denying Him, debarring others from His path and oppression are far greater crimes than fighting in the sacred months. In other words, idolatry is worse than carnage. *"And they will not cease fighting against you unless they turn you back from your faith, if they could."* The disbelievers did not cease fighting with the Muslims in the sacred months; instead, they prevented them from visiting the *Ka'bah*, turned them out of their houses and tormented them with extreme forms of